Islami Tahreek

اتا ہوں

عالم اسلام کی مختصر تاریخ

عالم اسلام کی مختصر تاریخ

تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں اپنے چہرے کی طرح گزرے ہوئے زمانے کے لوگوں کے چہرے دیکھے جاسکتے ہیں۔

مصنف

محمد عبدالغفار

باغ مہتاب سرینگر کشمیر

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں(C)

نام کتاب:

عالم اسلام کی مختصر تاریخ

مصنف:

محمد عبدالغفار

سنہ اشاعت:

ھ

تعداد:

تعداد صفحات:

کمپوزنگ:

محمد اشرف ڈار

ناشر:

قیمت:

پیش لفظ

عام فہم لفظوں میں لکھی گئی اس مختصر اسلامی تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ پڑھنے والا اسلامی تاریخ سے پوری طرح واقف ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ سے صحیح معنوں میں وہی شخص استفادہ کرسکتا ہے جو مطالعہ کیلئے غیر مُتعصب ہو اور کشادہ دلی سے ایک سرگرم طالب علم کی حیثیت سے مذہبی اختلافات کو نظرانداز کرکے تاریخ کا مطالعہ کرنے کا خواہشمند ہو۔

محمد عبد الغفار

فہرست مضامین

نمبر شمار

عنوان

صفحہ نمبر

پیش لفظ

انسان کے متعلق منکرین خدا (Atheists) کا خیال

مذہبی لوگوں کا عقیدہ

پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ شروع

خاتم النبین سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد

مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت

جنگ بدر مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی پہلی جنگ

جنگ عہد

جنگ احزاب

محمدؐ کی عمرہ کی طرف روانگی اور صلح حدیبیہ کا معاہدہ

جنگ خیبر

فتح مکہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

محمدؐ کی سیرت حالات زندگی

اسلام کا نظریہ

قرآن مجید

سنتِ رسول

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال

خلافت کا آغاز

خلیفہ اوُل حضرت ابوبکر صدیق٦

خلیفہ دوم حضرت عمر٦

خلیفہ کا طرز عمل

خلیفہ سوم حضرت عثمان٦

خلیفہ چہارم حضرت علی٦

حضرت امیر معاویہ٦

خانہ جنگی اور کربلا کا واقعہ

خلافت یزید کے ہاتھوں میں

عبدالملک (65تا 86ہجری)

ولید بن عبدالملک (86تا 96ھ)

سلمان بن عبدالملک

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز

یزید بن عبدالمالک یزید ثانی

ہشام بن عبدالملک

ولید بن یزید ولید ثانی

یزید بن ولید ۔ یزید ثالث یعنی تیسرا یزید

ابراہیم بن ولید

مروان بن محمد

عباسی دور. بغداد کا عروج

عبداللہ بن محمد المعروف سفاح

ابو جعفر منصورؔ

محمد مہدی

ہادی محمد

ہارون رشید

ابراہیم اغلب

مامون رشید

معتصم باللہ

واشق باللہ

متوکل معتصم

عباسی حکومت کا زوال

مہتدی باللہ

خلیفہ معتمد علی اللہ

خلیفہ موفق باللہ

خلیفہ معتضد باللہ

مکتفی باللہ

مقتدر باللہ

قاہر باللہ

راضی باللہ

متقی باللہ

برصغیر ہند ۔ موجودہ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں اسلام کا ظہور

محمد بن قاسمؒ اور فتح سندھ

محمد بن قاسم کے بعد سندھ کے حالات

مذہبی حالات

ہندوستان میں غزنوی دور کا آغاز

امیر ناصرالدین سبکتگین غزنوی

سلطان محمود غزنوی

سلطان مسعود غزنوی

غزنوی دور میں علم و ادب کا عروج

غوری خاندان

سلطان معزالدین محمد غوری

خاندان غلامان

قطب الدین ایبک

سلطان التمش

رضیہ سلطانہ

ناصر الدین محمود

سلطان غیاث الدین بلبنؔ

کیقباد خان کی تخت نشینی

خلجی خاندان کا آغاز

جلال الدین خلجی

علاؤ الدین خلجی سکندر ثانی

سلطان علاؤ الدین کی کارگزاری اور صفات

علاؤ الدین کا نظریہ اسلام

خلجی خاندان کا خاتمہ

قطب الدین مبارک شاہ

سلطان ناصر الدین خسرو

تغلق خاندان کی ابتدا

سلطان غیاث الدین تغلق

سلطان محمد تغلق

سلطان فیروز شاہ تغلق

سلطان ناصرالدین محمود تغلق

محمود تغلق کی دہلی واپسی

خاندان سادات کی حکومت

سلطان خضر خان

لودھی خاندان

بہلول لودھی

سکندر لودھی

ابراہیم لودھی

مغلیہ حکومت کی ابتدا

ظہیر الدین بابر

ہمایوں کی تخت نشینی

شیر شاہ سوری کی حکومت

ہمایوں کی دہلی واپسی

جلال الدین اکبر کا دور حکومت

اکبر کے فتوحات

اکبر کا نظام حکومت

اکبر کی صلح کل کی پالیسی

اکبر پر بے دینی کے الزامات اور ان کی مخالفت

اکبر کے عمومی یعنی عام احکامات

اکبر کا نیا مذہب دین الٰہی

خان اعظم عزیز کوکہ

اکبر کی وفات

محمد سلیم جہانگیر کی تخت نشینی

مُجدِّد الف ثانی جہانگیر کے دربار میں

وحدت الوجود (Pentheism) کا نظریہ پیش خدمت

حضرت مجدد الف ثانی کی مذہبی خدمات

اختلافات کا حل

شیخ عبدالحق محدث دہلوی دینی علوم کا نیا دور

عہد شاہجہانی

شہاب الدین محمد شاہجہان کی تخت نشینی

حضرت شیخ میاں میر قادری

ملا شاہ قادری

شیخ سرمد

دبستان مذاہب کی اصلیت

شیخ محب اللہ الہ آبادی

شہزادہ دارا شکوہ

شاہجہان کے تعمیراتی کام

مغل تعمیرات

اورنگ زیب کا دور حکومت اور شریعت کا عروج

اصلاحات عالمگیری

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی وفات

بہادرشاہ اول 1707 - 1712

جہاندار شاہ (1712 - 1713)

برخ سیار (1713 - 1719)

محمد شاہ (1719 - 1748)

احمد شاہ ابدالی (1748 - 1754)

عالمگیر دوم (1754 - 1759)

شاہ عالم دوم (1759 - 1806)

اکبر دوم (1806 - 1837)

بہادر شاہ ظفر دوم (1837 - 1857)

کشمیر میں اسلام کی آمد

عبدالرحمان بلبل شاہ

حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ

میر سید محمد ہمدانیؒ

کشمیر میں ریشیوں کی اصلیت

شیخ نور الدینؒ کی تبلیغی خدمات

ریشیوں کے تبلیغی کام

صوفی مبلغین کی تبلیغی خدمات

کشمیر میں خانقاہوں اور درگاہوں کی حیثیت اور حقیقت

سلطان سکندر کے دور حکومت میں اسلام کی اشاعت

تاریخی حقائق

سلطان زین العابدین بڈشاہ پر مشرک ہونے کے الزامات

انسان کے متعلق منکرین خدا (Atheists) کا خیال

انسان کی ابتدائی زندگی سے لے کر موجودہ زندگی تک دنیا میں جو حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوئی اس سے انسان خود واقف ہے۔ منکرین خدا کہتے ہیں کہ ابتدائی انسان ایک حیوان کی طرح زندگی گزارتا تھا یعنی مختلف حیوانوں کی طرح وہ بھی ایک حیوان تھا لیکن دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں وہ زیادہ ہونہار اور ہوشیار تھا۔ اسکی دانائی اور ہونہاری کی وجہ سے اسے حیوان ناطق (Rational animal) کہا گیا ہے۔ اس حیوان ناطق نے رفتہ رفتہ اپنی عقل اور سمجھداری کا استعمال کرکے اپنی زندگی کا طرز عمل بدل دیا۔ پہلے وہ حیوانوں کی طرح غار میں رہتا تھا پھر اس نے رہائش کے طریقے کو بدل کر رہنے کے لئے گھر بنایا اور ایک دوسرے سے بات کرنے کا طریقہ سیکھ لیا اور ایک دوسرے سے مل کر رہنے لگا۔ اس طرح سے انسانوں میں ایک مہذب زندگی وجود میں آگئی اور دنیا میں آج ہم جو زندگی گزارتے ہیں یہ اسی ابتدائی انسان کی ترقی یافتہ زندگی ہے جو ڈارون کا نظریہ ارتقائ (Darwin's theory of evolution) کہلاتا ہے ان کے اس نظریہ کے مطابق جاندار چیزوں کو کسی نے موجودہ شکل میں پیدا نہیں کیا بلکہ ہر شے بقائے اصلح یعنی بہترین صورت اختیار کرنے کی دلیل کے مطابق حیوانات اور نباتات میں طاقتور اور قابل افراد بچ جاتے ہیں اور کمزور اور نکمے فنا ہوجاتے ہیں۔

مذہبی لوگوں کا عقیدہ

یہ لا مذہب اور لادین لوگوں کا انسانی زندگی کے متعلق نظریہ اور خیال ہے۔ لیکن مذہبی لوگوں کا عقیدہ اور دعویٰ اس کے بر عکس ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ انسان کی تاریخ حضرت آدم اور ان کی بیوی حضرت حوا کی پیدائش سے شروع ہوئی کہ جب خدا نے ان دونوں کو پیدا کرکے جنت میں ڈال دیا اور حکم دیا کہ میری عبادت کرکے اپنی زندگی بسر کرو اور اس بات کی تاکید کی کہ جنت میں موجود ایک درخت کے پاس مت جانا اور اگر آپ نافرمانی کرکے اس درخت کے پاس چلے گئے تو آپ دونوں کو جنت سے نکال دیا جائے گا۔ اس طرح سے آدم کی زندگی کا امتحان شروع ہوگیا۔

جب آدم اور ان کی بیوی حوآ نے جنت میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تو شیطان نے آکر انہیں اس ممنوع درخت کے پاس جانے کے لئے اکسایا جب انہوں نے مذکورہ درخت کے پاس جاکر خدا کی نافرمانی کی تو انہیں جنت سے نکال کر زمین پر پھینک دیا گیا۔ پھر جب انہوں نے توبہ کی تو انہیں دوبارہ جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی گئی۔ لیکن خدا نے اب ان کے لئے اور ان کی اولاد کے لئے یہ شرط رکھدی کہ جو لوگ خدا کے فرمان کے مطابق خدا کی بندگی کریں وہ اپنے آبائی مقام جنت کو دوبارہ حاصل کرلیں گے اور جو نافرمانی کریں گے ان کو جہنم کی آگ میں جلادیا جائے گا اور اللہ کے اس اعلان کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی نے اپنے کھوئے ہوئے مقام یعنی جنت میں دوبارہ داخل ہونے کے لئے خدا کی بندگی شروع کردی۔

پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ شروع

آدم کے بعد جب ان کی اولاد دنیا میں جگہ جگہ پھیل گئی تو اللہ نے ان تک اپنی ہدایات پہنچانے کے لئے یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیج دئے جنہوں نے لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچایا۔ پیغمبری کا یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین (نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے) پیغمبر پر ختم ہوا۔ اکثر نبیوں پر کتابیں اَتاری گئیں جن میں توراتؔ، انجیلؔ اور زبورؔ قابل ذکر ہیں۔ توریت حضرت موسیٰ پر انجیل حضرت عیسٰی پر اور زبور حضرت داؤد پر نازل کی گئی۔ ان پیغمبروں کی ہدایت پر لوگ صحیح راستہ اختیار کرلیتے تھے اور ایک خدا کی بندگی کرتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ اصل راستے سے بھٹک کر اپنی نفسانی خواہشات کو رہنما بنا کر پیغمبروں کی تعلیم کو بھلا دیتے تھے اور ایک اللہ کی عبادت کرنے کے بجائے بہت سارے بتوں کی پوجا کرتے تھے اور جن لوگوں کے پاس اللہ کی طرف نازل کی گئی کتابیں تھیں انہوں نے ان میں ردوبدل کرکے اپنی مرضی کے تابع بنا دیا جیسا کہ توراتؔ اور انجیل میں اس طرح کا ردوبدل کیا گیا کہ اب یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ ان پیغمبروں کی صحیح تعلیم کیا تھی۔ حالانکہ ان سب نے ایک تعلیم دی تھی جو صحیح معنوں میں دین اسلام کی تعلیم تھی کہ صرف ایک خدا کی عبادت کی جائے۔ لیکن پیروی کرنے والوں نے ان پیغمبروں کو ہی اپنا معبود بنا ڈالا۔ جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسٰیؑ کو خدا کا بیٹا بنا کر ان کی عبادت شروع کردی۔ اور اسی طرح یہودیوں نے عَزیرؔ کو اپنا معبود بنادیا۔ خدا تعالیٰ نے آدمؑ کی اولاد پر رحم کھا کر پچھلی امتُوں کی گمراہی کو دور کرنے اور اپنے پیغام کو اسلام کی پیروی میں قیامت تک زندہ رکھنے کے لئے اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا اور انہیں قرآن کے نام پر کتاب عطا کی جس کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے خود لی تا کہ اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہ رہے اور لوگ اپنے خالق حقیقی یعنی اپنے پیدا کرنے والے معبود برحق کی ہدایت پر تاقیامت عمل کرسکیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب پیغمبروں، نبیوں اور رسولوں کا ایک ہی پیغام ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے بھیجے ہوئے دین حق، اسلام کی پیروی کرو اور جان لو کہ سارے پیغمبر ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں اور اس زنجیر کی آخری کڑی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان سب کی دعوت ایک ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

خاتم النبین سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز اس وقت ہوا جب عرب کے لوگ توحید یعنی ایک خدا کی عبادت کرنے کی تعلیم کو بھلا کر بت پرستی کررہے تھے اور خانہ کعبہ کو بت خانہ بنادیا تھا۔ اس میں تین سو ساٹھ (360) بت جمع کئے گئے تھے۔ لوگ لڑائی جھگڑوں، قتل و غارت، لوٹ مار، شراب نوشی اور طرح طرح کے برے کاموں میں مشغول تھے۔ عرب کے اس بے حیا اور بے ضمیر ماحول میں محمدؐ نام کے صرف ایک انسان تھے جو ان برائیوں سے پاک اور محفوظ تھے جو صرف ایک خدا کی عبادت کرنے کے غور وفکر میں رہتے تھے اور اس غور وفکر کے لئے وہ غار حرآنام کی ایک غار میں پناہ لیتے تھے اور کئی کئی دنوں تک اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ آخر کار ایک دن اللہ نے انہیں اسی غار میں حضرت جبریلِ کے ذریعے سے نبیؐ اور رسول ہونے کی خوشخبری سنادی جبریلِ وہی فرشتہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام نبیوں اور رسولوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتے تھے۔ یہ پیغام اللہ کے مقرر کردہ دین اسلام کا پیغام ہے۔ یعنی خدا کو ایک ماننا اسی کے آگے سر جھکانا اور اسی کی عبادت کرنا وغیرہ۔ اس کے بعد آپؐ کو حکم ہوا کہ اللہ کے اس پیغام کو لوگوں تک پہنچادیں۔ حکم ملتے ہی آپؐ نے یہ پیغام دوسروں تک پہنچانے کا کام شروع کردیا۔ آپؐ نے خدا کے دین کی دعوت کا آغاز اپنے گھر سے شروع کیا۔ آپ نے تین سال تک خاموشی سے دین اسلام کی تبلیغ کی اور اس ابتدائی دور میں تقریباً چالیس (40) لوگوں نے اسلام قبول کیا جن میں حضرت عثمان٦، حضرت زبیر٦، حضرت عبدالرحمان بن عوف٦، حضرت سعد بن وقاص٦، حضرت طلحہ٦، حضرت عمار بن یاسر٦، حضرت عبداللہ بن مسعود٦ اور حضرت ابو عبیدہ٦ کے نام نمایاں ہیں جنہوں نے اسلام کی خدمت کرکے اسلامی تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دئے۔

مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت

تین سال تک خاموش تبلیغ کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان دین اسلام کی تبلیغ شروع کردی۔ ایک دن مکہ کے تمام لوگوں کو جمع کرکے پوچھا کہ کیا تم مجھے سچا سمجھتے ہو؟ سب لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا کہ ہم نے آپ سے ہمیشہ سچ ہی سنا اور آپ سے کبھی جھوٹ نہ سنا تو آپؐ نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو پھر میری بات مان لو اور ایک خدا پر ایمان لاؤ اور بت پرستی چھوڑ دو۔ لیکن بت پرستی نے عربوں کے دلوں کو فتح کرلیا تھا۔ انہیں نبیؐ کی سچائی جاننے کے باوجود یہ بات ناگوار گزری کہ وہ بت پرستی چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کریں۔ اس لئے انہوں نے سچے دین کو ماننے اور ایک خدا کی عبادت کرنے سے انکار کیا اور کافر کہلائے۔ اس کے بعد اسلام پھیلتا گیا اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ لیکن مسلمانوں پر کافروں کے ظلم میں بھی اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ مسلمانوں کو مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ انہوں نے چھپتے چھپاتے مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ میں پناہ لی اور وہاں پہنچ کر اخوت یعنی ''بھائی چارہ'' کا نظام قائم کردیا۔ مکہ سے آئے ہوئے لوگ مہاجر (ہجرت کرنے والے) کہلائے اور مدینہ کے مسلمانوں کو انصار یعنی مددگار اور ہاتھ بٹانے والے کا نام دیا گیا۔ مہاجرین چونکہ اپنے گھروں سے چوری چھپے نکلے تھے اور اپنی ہر کوئی چیز مکہ میں چھوڑ کر آئے تھے۔ لیکن اس بھائی چارہ کے نظام کے تحت انصار نے مہاجرین کو اپنے بھائی سمجھ کر اپنی جائیداد میں شریک کرلیا۔ اس طرح انصار اور مہاجرین کے درمیان آپسی بھائی چارہ (Brotherhood) کا ایک ایسا نظام قائم ہوا جس کی مثال آج تک دنیا میں کہیں نظر نہ آئی۔

مدینہ میں مسلمان آباد (Settle) ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور اہم قدم اٹھایا کہ آپؐ نے مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکوں پر مشتمل ایک سیاسی نظام قائم کیا جس سے مسلم ریاست وجود میں آگئی۔ جس کی سرپرستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی۔ اس ریاست کے استحکام کے لئے ایک تحریری معاہدہ کیا گیا جو دنیا کی تاریخ میں پہلا دستور یا آئین (Constitution) تھا۔ اس معاہدہ کے تحت مدینہ کے یہودیوں اور مشرکوں کے ساتھ سیاسی اتحاد گٹھ جوڑ کیا گیا۔ جس پر محمدؐ کی قیادت میں مسلمانوں کا کنٹرول تھا اس معاہدے کے مطابق غیر مسلموں کو مسلم ریاست میں جو حق حاصل تھا اسے جدید اصطلاح میں اندرونی خود مختاری یا حق خود ارادیت (Self rule) کہا جاسکتا ہے۔

جنگ بدر مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی پہلی جنگ

مدینہ میں مسلمانوں کی یہ کامیابی کافروں کو سخت ناگوار گزری انہوں نے مدینہ پر چڑھائی کی۔ اس طرح مسلمانوں اور مکہ کے کافروں اور مشرکوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی جو جنگِ بدر کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں تین سو تیرہ (313) مسلمانوں نے ایک ہزار سے زائد کافروں کو شکست فاش دے دی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن اور کافروں کا سردار ابو جہل مارا گیا۔

جنگ عہد

جنگ بدر کے بعد جنگ عہد کے نام سے دوسری بڑی جنگ ہوئی جس میں سات سو (700) مسلمانوں نے تین ہزار کافروں کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں کافروں کی فوج کا سردار ابو سفیان تھا۔ مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ شہید ہوگئے۔ لیکن آخر کار کافرین میدان جنگ سے فرار ہوگئے۔ جبکہ مسلمان جنگ کے آخر تک میدان جنگ میں موجود رہے اور اپنی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔

جنگ احزاب

تیسری بڑی جنگ غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب کہلاتی ہے۔ اس جنگ میں عرب کے قبیلے کافروں کے ساتھ تھے اور مدینہ کے یہودیوں کا تعاون بھی انہیں حاصل تھا۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے اپنی دفاع کے لئے مدینہ کے اردگرد خندق کھود لی تھی۔ اس لئے اسے جنگ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں بھی ابو سفیان کافروں کے کمانڈر تھے۔ لیکن چند دنوں کے محاصرہ کے بعد کافروں نے راہ فرار اختیار کیا۔

محمدؐ کی عمرہ کی طرف روانگی اور صَلح حَدَیبِیَہ کا معاہدہ

غزوہ احزاب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ رواج یہ تھا کہ حج کے زمانے میں لڑائیاں بند کردی جاتی تھیں اور عرب کے ہر طرف سے لوگ بغیر کسی پابندی کے حج کرنے آتے تھے۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو حدیبیہ کے مقام پر آپؐ کو اطلاع ملی کہ کافر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کررہے ہیں اور وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اطلاع دی کہ مسلمان لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ وہ عمرہ کے لئے آئے ہیں۔ لیکن کافر اپنی ضد پر اڑے رہے اور مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ جنگ پر نوبت آگئی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت عملی سے کام لے کر کافروں کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا جو صلح حَدیبیہ کہلاتا ہے اور اس معاہدے کے تحت یہ طے پایا گیا کہ مسلمان اس سال عمرہ کرنے کے بغیر واپس چلے جائیں اور اگلے سال بغیر کسی خوف و خطرے کے حج کے لئے آئیں۔ اگرچہ یہ معاہدہ مسلمانوں کو ناگوار گزرا کیونکہ وہ اس معاہدے کو اپنے لئے تذلیل سمجھتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی تعمیل میں انہوں نے اسے سرخم تسلیم کیا اور مدینہ واپس آگئے۔

صلح حدیبیہ کو اگرچہ مسلمان اپنی شکست سمجھتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے قرآن مجید میں فتح مبین یعنی روشن اور کھلی فتح قرار دیا۔ اِنَّا فَتَحۡنَا فَتۡحًا مُّبِیۡنًا اور نتیجہ کے اعتبار سے بھی یہ واقعی ایک بڑی فتح ثابت ہوئی کیونکہ اس صلح سے پہلے مسلمان کافروں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ لیکن صلح کے بعد دونوں میں میل ملاپ شروع ہوگیا۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی سے متاثر ہوکر کافر لوگ کثرت سے مسلمان ہونا شروع ہوگئے اور مکہ کی طرف سے کسی بڑے جنگ کا خطرہ بھی نہ رہا۔ مسلمانوں نے اطمینان سے دین اسلام کی اشاعت کی۔ اس دوران خالد بن ولید اور عمر بن عاص جیسے با اثر اشخاص مسلمانوں میں شامل ہوگئے اور ان سپاہ سالاروں نے اسلام قبول کرنے کے بعد حیرت انگیز جنگی کارنامے انجام دیئے اور بہت ساری فتوحات حاصل کرلیں۔

اسلام کا پیغام کسی ایک قوم یا علاقے کے لئے مخصوص نہیں بلکہ یہ ایک بین الاقوامی پیغام ہے جو سب لوگوں کے لئے یکساں ہے۔ جب عرب کے مختلف حصوں میں اسلام کی بنیاد مضبوط ہوگئی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران، روم اور حبش کے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کے لئے خطوط بھیجے۔ حبش کے بادشاہ نجاشی نے خط ملتے ہی اسلام قبول کیا۔ روم کے بادشاہ ہرقل اور رومی گورنر مُقوقِس نے اگرچہ اسلام قبول نہ کیا لیکن آپؐ کے قاصدوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ ہرقل کو آپؐ کے نبی ہونے کا یقین ہوگیا تھا۔ لیکن عیسائیوں کے ڈر سے اسلام میں داخل ہونے کا اعلان نہ کرسکے ایران کے بادشاہ خسرو پرویزؔ نے غرور کے نشے میں آکر خط کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ رسول اللہ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ خسرو کی سلطنت بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی۔ آپ کی یہ پیشن گوئی بعد میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی جب ان کی سلطنت پاش پاش ہوگئی۔

جنگ خیبر

صلح حدیبیہ کے بعد خیبر کا واقعہ پیش آیا اسلام سے پہلے مدینہ میں مشرکین کے علاوہ یہودی قبیلے بھی آباد تھے۔ جو یہودی نبی کے ظہور کا انتظار کررہے تھے۔ جب محمدؐ نے نبوت کا اعلان کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خاتم النبین کے لقب سے نوازا تو چند سمجھدار یہودیوں کے بغیر سب یہودیوں نے انجیل میں موجود محمدؐ کی نبوت کی پیش گوئی کے باوجود آپ پر ایمان لانے سے انکار کیا۔ مدینہ پہنچ کر اگرچہ محمدؐ نے یہودیوں کو اپنا حلیف بنا کر ان سے برادری کا معاہدہ کیا تھا۔ لیکن یہ لوگ درپردہ اسلام کو ختم کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کافروں سے ساز وباز کرکے آپؐ کو زہر دے کر قتل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ اس طرح محمدؐ یہودیوں کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے ان کے خلاف سخت کاروائی کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس کاروائی کے دوران یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کیا گیا اور باقی بچے ہوئے مدینہ سے نکل کر خیبر میں آباد ہوگئے اور مدینہ سے نکلنے کے بعد بھی یہ لوگ مسلمانوں کی مخالفت کرنے سے باز نہ رہے اور مکہ کے کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف بدستور سازشیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگ خندق میں عرب کے کافروں کو ان ہی یہودیوں نے

ساتھ دیا۔ خیبر کی اس جنگ میں حضرت علی٦ نے یہودیوں کے ایک مضبوط قلع کو فتح کیا۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ کے دو سال بعد جب مکہ کے مشرکوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ منسوخ کردیا تو نبیؐ نے دس ہزار صحابیوں کی فوج لے کر مکہ پر دعویٰ بول دیا اور مکہ کے لوگوں نے بلا مقابلہ مکہ مسلمانوں کے سپرد کردیا۔ مسلمانوں نے کعبہ کو بتوں کی غلاظت سے صاف کردیا اور اسے دوبارہ ایک خدا کی عبادت کے لئے مخصوص کر کے حضرت ابراہیمؑ کی روایت کو زندہ کردیا۔

فتح مکہ کے بعد نبیؐ نے عام معافی کا اعلان فرمادیا یہاں تک کہ اپنے محبوب چچا حضرت حمزہؓ کے قاتلوں اور ابو سفیان کی بیوی ہندہ، جس نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا کو بھی معاف فرمایا۔ مکہ کی اس پُرامن فتح اور دشمنوں سے حَسنِ سلوک کی مثال نہ پہلے اور نہ آج تک تاریخ میں ملتی ہے۔ آپ کے اس حَسنِ سلوک کا یہ نتیجہ نکلا کہ خوفناک دشمنان اسلام ابو سفیان اور ان کی بیوی نے اسلام قبول کیا اور مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے کہا کہ اسلام لانے سے پہلے محمدؐ کی نفرت ہم سے زیادہ کسی کو نہ تھی اور اب محمدؐ سے زیادہ محبت ہمیں دنیا کے کسی انسان سے نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں چند دن رہنے کے بعد واپس مدینہ تشریف لائے۔ فتح مکہ کے بعد عرب کے لوگوں کو اسلام کی صداقت کا یقین ہوگیا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے اور دو سال کے عرصہ میں سارا عرب اسلام کے دائرے میں آگیا۔ تئیس (23) سال پہلے عرب کے سارے لوگ نبیؐ کے دشمن تھے لیکن اب سارے کے سارے آپؐ کے ہمدرد اور دوست بن کر اسلام میں داخل ہوگئے اور اسلام کے خیر خواہ اور فدائی بن گئے۔ فتح کے دو سال بعد دس (10) ہجری میں آپؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ مسلمانوں کو آپؐ کے اس ارادہ کی خبر ملی تو عرب سے ہر طرف کے لوگ مدینہ پہنچ گئے اور آپؐ کے ساتھ حج کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمانوں نے حج کا فریضہ ادا کرکے بیت اللہ کی زیارت کی۔ حج کے موقع پر آپؐ نے ایک فصیح اور بلیغ تقریر کی جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطبہ انسانی حقوق (Human Rights) کی حیثیت سے دنیا کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خطبے کا خلاصہ یہ ہے۔

''آج کے دن عہد جاہلیت کے تمام طور طریقے ختم کردئے گئے خدا ایک ہے اور تمام انسان آدمِ کی اولاد ہے اور سب برابر ہیں۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں اگر کسی کو فضیلت ہے تو نیک کام کی وجہ سے ہے اور سب مسلمان بھائی بھائی ہیں''۔ اس خطبہ میں آپؐ نے انتقام گیری کو جس کا عہد جاہلیت میں رواج تھا اور جس کی وجہ سے نسل در نسل خاندانوں میں دشمنی چلی آئی تھی سختی سے منع کیا اور سودی کاروبار کو حرام قرار دیا۔ عورتوں اور غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی آپؐ نے مسلمانوں کو ہدایت دی کہ وہ اللہ لی کتاب قرآن مجید کو مضبوطی سے تھام لیں تاکہ گمراہ نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد آپؐ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا!

لوگو کیا میں نے آپ تک خدا کا پیغام پہنچایا؟ سب لوگوں نے ایک آواز میں کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے ہم تک خدا کا پیغام پہنچایا اس پر آپؐ نے آسمان کی طرف اِنگلی اٹھائی اورتین بار فرمایا: اے اللہ آپ گواہ ہیں۔ اس تقریر کے بعد یہ آیت نازل ہوئی اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً۔ (القرآن)

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کردی اور تمہارے لئے دین اسلام کا انتخاب کرلیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

اللہ کے دین کو قائم کرکے محمدؐ نے تریسٹھ (63) سال کی عمر پاکر ہجرت کے گیارہویں سال ربیع الاوّل کی بارہ (12)تاریخ پیر (Monday) کے دن وفات پائی اور مسجد نبوی کے ساتھ جس کمرے میں آپؐ قیام فرماتے تھے اسی میں دفن کئے گئے۔

محمدؐ کی سیرت حالات زندگی

آپؐ نے 23 سال تک دین اسلام کی تبلیغ کی۔ تیرہ (13) سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں گزارے۔ زندگی کے اس سفر کے دوران آپؐ کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آپؐ نے صبر جمیل اور ثابت قدمی سے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور باطل کے آگے کبھی سرنڈر نہ کیا۔ آپؐ پورے عرب کے حکمران بن گئے۔ لیکن دنیا کے بادشاہوں اور حکم رانوں کی طرز زندگی کے برعکس عام انسانوں کی طرح سادہ زندگی گزاری۔ تخت شاہی کے بجائے آپؐ ایک سادہ بچھونے پر سوکر راتیں گزارتے تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے اور سادہ صاف و پاک رزق حلال کھاتے تھے۔ نہ محل بنایا نہ نوکر چاکر رکھے ایسے مکان میں رہتے تھے جو اس وقت کے عام مکانوں سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ زمین پر سوجاتے یا چارپائی پر بستر کوئی خاص نہیں بلکہ عام ہوتا تھا۔ آپؐ کا سارا وقت یا تو اللہ کی عبادت میں صرف ہوتا تھا یا لوگوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں۔ رات کا بڑا حصہ خدا کی عبادت میں گزارتے اور دن میں عبادت کے علاوہ لوگوں کے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ الغرض آپؐ کی زندگی قرآن مجید کا عملی نمونہ ہے۔ جو مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی زندگی مسلمانوں کے لئے سب سے اچھا نمونہ اور رہبر و رہنمائی ہے اور ہر وقت ہر دور اور ہر زمانے کے لئے مشعل راہ ہے۔ جس کام پر آپؐ خود عمل کرتے تھے اسی پر دوسروں کو عمل کرنے کی ہدایت دیتے تھے۔ آپؐ کے سامنے امیر و غریب سب برابر تھے۔ لوگوں کے ایسے ہمدرد تھے کہ ایک سفر کے دوران بوڑھی عورت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں۔

اسلام کا نظریہ

ترک دنیا اور رہبانیت یعنی نیکی کی تلاش میں جنگلوں اور ویرانوں کا رُخ کرنا اور شادی بیاہ کو نفس پرستی سمجھنا اسلام کی تعلیم اور نظریہ کے خلاف ہے اور اس طرز عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ نیک عمل اور دُنیائی زندگی کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔ اگر ہم دنیا کے کام خدا کی رضا کے لئے کریں تو وہ نیکی ہے اور اگر اپنے کام سے خدا کو ناراض کریں تو وہ بدی ہے۔ شادی بیاہ کر کے زندگی گزارنا ایک صحت مند معاشرے کی علامت ہے۔ آپؐ نے اپنی زندگی میں کئی شادیاں کیں جن میں بیوہ عورتیں بھی شامل تھیں اور آپؐ کی پہلی شادی ایک بیوہ عورت حضرت خدیجہ ؓ سے ہوئی تھی۔ کئی بیویاں ایسی تھیں جن کو آپؐ نے سہارا دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کے ایک سے زیادہ نکاح نفس پرستی نہیں بلکہ عورتوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہے۔ آپؐ کے بال بچے تھے جن سے آپؐ بہت پیار و محبت کرتے تھے اور آپؐ نے اپنے اہل و عیال سے محبت اور ہمدردی کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

قرآن مجید

اسلامی تعلیمات کا سب سے بڑا ماخذ قرآن مجید ہے جو قیامت تک مسلمانوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ اور زندگی کا آئین ہے۔یہ اللہ کا کلام ہے اور اسی کی حفاظت میں ہے۔یہ غلطیوں اور کوتاہیوں سے پاک ہے۔ اللہ کی اس کتاب میں اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس پر شک کرنے والوں کو اللہ کا چیلنج ہے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ قرآن محمدؐ کا اپنا کلام ہے تو تم لوگ قرآن جیسی ایک سورت (سورۃ) یا ایک ہی آیت لاؤ۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔ لیکن بہت کوشش کے باوجود آج تک کوئی شخص ایک سورت کیا بلکہ ایک آیت بھی قرآن جیسا نہ لاسکا اور قرآن کا یہ چیلنج نہ نزول قرآن کے وقت کسی نے قبول کیا اور نہ کسی نے آج تک اس جیسا کلام لانے کی جرأت کی اور نہ کسی نے اس میں ایک لفظ یا ایک جملے، آیت کی غلطی کی نشاندہی کی۔ کیونکہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح آپؐ سے پہلے نبیوں کو دی گئی کتابوں جیسے تورات، زبور اور انجیل میں تحریف (تبدیلی) کی گئی اور ان کی اصلی تعلیم کو مسخ کیا گیا۔ قرآن میں اس طرح کی کوئی حرکت کرنے کی کسی نے جرأت نہ کی کیونکہ قرآن اللہ کی حفاظت میں ہے۔ لہٰذا نہ آج تک اس میں کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ روز قیامت تک اس میں کسی تحریف و تبدیلی کا امکان ہے۔ قرآن کو نازل ہوئے تقریباً چودہ سو (1400)سال کا عرصہ ہوا لیکن آج تک اس میں ایک سورہ (Chapter) تو کیا ایک آیت (Sentence) کی تبدیلی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ نے خود اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں اس کا ذکر ہے۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ (الحجر:۹)

ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔

سنتِ رسول

اسلامی تعلیم اور اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ سرچشمہ سنت رسول یعنی رسول اللہؐ کا طریقہ اور عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی زندگی اور ذاتِ مقدّس کو مسلمانوں کے لئے اسوہ حسنہ یعنی سب سے اچھا

نمونہ قرار دیا۔ اللہ کا فرمان ہے کہ اگر مسلمانوں کو کسی بات پر اختلاف ہو تو وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کریں۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔

یہ بات صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا مکمل مجموعہ آپؐ کی زندگی کے دوران مرتب نہیں ہوا اور نہ مسلمانوں نے اس کی ضرورت محسوس کی کیونکہ آپؐ کی ذات مقدس ان کے درمیان موجود تھی۔ بعد میں ان احادیث کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور ان کو تحریر کرکے کتابی شکل میں پیش کیا گیا اور احادیث کی یہ کتابیں مسلمانوں کے پاس موجود ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال

خلافت کا آغاز

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق؃

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال تک سارا عرب مسلمانوں کے قبضے میں آچکا تھا اور ملک میں ایک مرکزی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ آپؐ نے اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر نہیں کیا۔ مسلمانوں نے بہ اتفاق رائے حضرت ابوبکر؃ کو رسول اللہ کا جانشین اور اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ وہ آپؐ سے بے حد محبت کرتے تھے اور مردوں میں سب سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ آپؐ کی ہر بات کی بغیر کسی شک و شبہ کے تصدیق کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ صدیق یعی سچائی کی تصدیق کرنے والا کہلائے گئے۔ انہوں نے ہر مشکل اور نازک موقع پر آپؐ کا ساتھ دیا۔ وفات سے پہلے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کی وجہ سے مسلمانوں کو نماز نہ پڑھا سکے تو آپؐ کے حکم سے انہوں نے امامت کا فریضہ انجام دیا۔ بیُت لینے کے بعد انہوں نے لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ لوگو میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں۔ حالانکہ میں تمہاری جماعت میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھے کام کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر غلط راستے پر چلوں تو مجھے سیدھا کردو۔ تم میں جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کا حق اس کو دلادوں اور جو تم میں قوی ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق حاصل کرکے حقدار کو دلادوں۔ اگر میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر میں ان کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت مت کرو۔

خلیفہ اوّل کی اس تقریر میں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان حکمران کسی بھی صورت میں مطلق العنان یعنی خود مختار نہیں ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے اسلامی قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو عوام کو اختیار ہے کہ اسے حکمرانی کے عہدے سے ہٹادیں۔ ان کی تقریر سے عوام کے حقوق کی نشاندہی ہوئی اور حکمران کے فرائض اور حدود واضح ہوگئے جو اسلام کے سیاسی نظام میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ بعد میں خلفائے راشدین نے انہیں خلافت کے رہنما اصول بنا کر حکومت کی۔ یہ وہ حقوق اور فرائض ہیں جن کی سراہنا مغربی دنیا نے کی۔ اگرچہ وہ انہیں اپنے آئین میں جگہ نہ دے سکے۔ دراصل پورے عرب میں رسول اللہؐ کے زمانے میں ہی مسلمانوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی اگرچہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ نبیؐ کی وفات کے بعد انہوں نے بغاوت کر دی اور ان میں مسلمہ کذاب پیش پیش تھا جس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ خلیفہ نے سب سے پہلے ان باغیوں کی سرکوبی کے لئے فوج کشی کی جس کی قیادت سپاہ سالار خالد بن ولید نے کی اور مخالفین کو شکست دے کر انہیں اسلام کے دائرے میں لایا۔

عرب کی سرزمین پر دو بڑی مضبوط حکومتیں قائم تھیں ایک ایرانی حکومت اور دوسری رومیوں کی حکومت ایران کے بادشاہ کسریٰ اور روم کے بادشاہ قیصر کہلاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے دنیا کی ان دونوں بڑی سلطنتوں کے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کے لئے خطوط بھیجے قیصر روم ہرقل نے اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن نبیؐ کے قاصد سے اچھا سلوک کیا۔ لیکن ایران کے بادشاہ خسرو پرویز المعروف کسریٰ نے آپؐ کا خط پھاڑ کر پھینک دیا اور سفیر کو اپنے دربار سے نکلوا دیا۔ نبیؐ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کی سلطنت بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی جو بعد میں سچ ثابت ہوا۔ جب فارس موجودہ ایران کی سلطنت ٹکڑوں میں بٹ گئی اور مسلمانوں کے قبضے میں آگئی اور آج تک اسلامی ملک ایران کے نام پر دنیا میں موجود ہے۔ ایران اور روم کا کچھ حصہ موجودہ ترکی کی دونوں حکومتوں سے مسلمانوں کی جنگ ہوئی اور دونوں نے اسلام قبول کیا اور آج تک دنیا میں اسلامی سلطنتوں کی حیثیت سے سر اٹھائے موجود ہیں۔ خلیفہ حضرت ابوبکر٦ کا ایک بڑا کارنامہ جمع القرآن ہے چونکہ دوران جنگ بہت سارے حافظ قرآن شہید ہوئے اس لئے خلیفہ نے صحابہ سے

مشورہ کرکے قرآن کو کتابی شکل دے دی جو آج مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ

حضرت ابوبکرؓ ڈھائی سال حکومت کرنے کے بعد وفات پاگئے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے قبر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ اتفاق رائے سے خلیفہ چن لئے گئے۔ وہ اسلام لانے سے پہلے مسلمانوں کے دشمن تھے۔ وہ آپؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے آپؐ کے پاس پہنچ گئے لیکن آپؐ کے دربار میں پہنچ کر ہدایت پاگئے اور اسلام قبول کرکے مسلمانوں میں شامل ہوگئے۔ ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کی طاقت بڑھ گئی اور مسلمانوں نے گھروں سے باہر نکل کر باجماعت نماز پڑھنی شروع کی۔ ان کی خلافت کے دوران حضرت سعد بن وقاصؓ اور خالد بن ولید کی سپاہ سالاری میں آتش پرست ایرانیوں اور روم کے عیسائیوں کو شکست ہوئی اور پھر دس سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے ایرانی سلطنت پر قبضہ کیا اور رومیوں سے شام، یروشلم، فلسطین اور مصر جیسے طاقتور ممالک چھین لئے۔ شام کی فتح کے بعد جب مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور عیسائی اس شرط پر سرنڈر کرنے پر آمادہ ہوگئے کہ خلیفۃ المؤمنین خود آکر صلح کا معاہدہ کریں تو حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کو جانشین مقرر کرکے بیت المقدس کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کے ساتھ ایک غلام اور سواری کے لئے ایک اونٹ تھا۔ اونٹ پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔ یہاں تک ایک لمبا سفر طے کرکے شوق و ذوق سے بیت المقدس پہنچ گئے۔ جب بیت المقدس پہنچ گئے تو اس وقت اپنی باری کے حساب سے غلام اونٹ پر سوار تھے اور خلیفہ لگام پکڑے ہوئے تھے۔ لوگوں نے غلام کو خلیفہ سمجھ کر زبردست استقبال کیا لیکن بعد میں جب انہیں معلوم ہوا کہ جس شخص کا انہوں نے خلیفہ سمجھ کر استقبال کیا وہ خلیفہ نہیں بلکہ خلیفہ کا غلام ہے جو اپنی باری سے اونٹ پر سوار تھا۔ مساوات کی اس حقیقت کو دیکھ کر وہ اسلام سے بہت متاثر ہوئے۔

بیت المقدس پہنچ کر انہوں نے عیسائیوں سے صَلح کرکے ایک صلح نامہ مرتب کیا جس میں ان کے جان و مال اور مذہب کی حفاظت کی ضمانت تھی۔ اس صلح نامہ کی رَو سے حضرت عمرؓ نے مقامی عیسائیوں کے مطالبہ پر یہودیوں کو بیت المقدس سے خارج کردیا اور اس طرح سے مسلمانوں کا قبلہ اول بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا اور مسلمانوں کی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔

حضرت عمر٦ نے ساڑھے دس سال تک خلافت کی۔ انہوں نے ایک ایسی عظیم الشان حکومت قائم کی جو رقبہ اور طاقت کے لحاظ سے ایک بہت بڑی حکومت تھی۔ ان کا عہد خلافت نہ صرف فتوحات کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ عدل و انصاف اور نظام حکومت کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ آپ کے عہد حکومت میں پہلی مرتبہ مختلف انتظامی محکمے قائم کئے گئے اور سرکاری آمدنی و خرچ کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا جو محکمہ دیوان کہلاتا ہے۔ ان کے اصلاحات کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) مملکت صوبائی کی تقسیم کاری، (۲) فوجی محکمے کا قیام، (۳) محکمہ مالیات کا قیام (۴) محکمہ پولیس کا قیام، (۵) محکمہ عدلیہ کا قیام، (٦)بیت المال کا قیام، (۷) زمین کی پیمائش کے محکمہ کا قیام، (۸) مردم شماری کے محکمے کا قیام، (۹) جیل خانے کا قیام، (۰۱) محکمے انفاریشن کا قیام، (۱۱) فوجی چھاونی کا قیام، (۲۱) اماموں اور اذان دینے والوں کے تقرر اور تنخواہ کا انتظام، (۳۱) مدرسوں اور مکتبوں کا نظام، (۴۱) ملک میں پولیس چوکیوں اور سرائیوں کا انتظام وغیرہ۔

اس طرح سلطنت انتظام کے لحاظ سے ایک منظم حکومت بن گئی۔

خلیفہ کا طرز عمل

ایک بڑی سلطنت کے حکمران ہونے کے باوجود حضرت عمر٦ سادہ زندگی گزارتے تھے، ان کے دور حکومت میں مال غنیمت میں آئی ہوئی چادریں جب مسلمانوں میں تقسیم ہوئیں آپ نے اپنے حصُہ میں آئی ہوئی چادر سے ایک کرتا بنواکرپہن لیا۔ ایک شخص نے یہ کہکر اعتراض کیا کہ ہر ایک کو اتنا ہی کپڑا حصُے میں آیا جس کا پورا کرتا نہ بنتا تھا تو آپ نے یہ کرتا کیسے بنوایا۔ آپ نے خوش خلقی سے جواب دیا کہ میں نے اپنے بیٹے کے حصُے میں آئی ہوئی چادر کے ساتھ اپنی چادر ملاکریہ کرتا بنوایا۔ یہ تھی حضرت عمر٦ کی حکومت اور مساوات جسے دور جدید کے جمہوریت کا دعویٰ کرنے والے حکمرانوں کی ترازو میں تولا نہیں جاسکتا۔

آپ کو نماز کے دوران ایک ایرانی مجوسی ابوؔ لولو نے خنجر سے وار کرکے بَری طرح سے زخمی کردیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے اس کی بے جا حمایت نہ کی تھی۔ چند روز زندہ رہنے کے بعد آپ نے اس دنیائے فانی سے انتقال فرمایا۔

آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ ایک تاریخی تجزیہ (Historical Analysis) کے مطابق ان کے قتل کی وجہ یہودیوں کی سازش تھی کیونکہ یہود انہیں اپنا سب سے بڑا طاقتور دشمن سمجھتے تھے۔

خلیفہ سوم حضرت عثمان؄

حضرت عمر٦ نے حضرت ابوبکر٦ کی طرح اپنی اولاد اور رشتہ داروں میں سے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کیا بلکہ آپ نے انتقال سے پہلے خلیفہ کے انتخاب کے لئے مندرجہ ذیل چھ (6) صحابہ کے نام تجویز کئے۔

حضرت عثمان٦، حضرت علی٦، حضرت زبیر٦، حضرت طلحہ٦، حضرت سعد بن وقاص٦ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف٦۔

اسلام کی خدمت کرنے میں ان صحابیوں کا نمایاں رول تھا اور وہ ان دس صحابیوں میں شامل تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں جانے کی خوشخبری دی تھی اس لئے عشرہ بشرہ کہلاتے تھے۔

مسلمانوں نے بہ اتفاق رائے حضرت عثمان٦ کو اپنا خلیفہ چن لیا۔ آپ ان مسلمانوں میں شامل تھے جنہوں نے ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا۔ آپ تجارت کرتے تھے اور آپ کا شمار قریش کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ آپ کی دولت سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان کے دور حکومت میں کئی فتوحات ہوئیں۔ مشرق میں غزنی اور کابل تک کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور مغرب میں تیونس جو اس زمانے میں افریقہ کہلاتا تھا فتح ہوگیا۔ مسلمان ایران اور ایشائے کوچک تک پہنچ گئے۔ ان کے عہد خلافت کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ بحری بیڑا تیار کیا۔ انہوں نے رعایا کے آرام کے لئے سڑکیں بنوائیں اور پل تعمیر کروائے، مسجد نبوی کی دوبارہ تعمیر کی اسے وسیع اور شاندار بنایا۔ ان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی ایک قرأت پر مسلمانوں کو متحد کیا۔ قرآن کو حضرت ابوبکر٦ کے زمانے میں ہی کتابی شکل دے دی گئی تھی۔ لیکن قرآن کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے لکھا اور پڑھا جاتا تھا۔ جس سے اس کی قرأت یعنی پڑھنے میں اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس اندیشے کے پیش نظر آپ نے تمام نسخوں کو جمع کرکے حضرت حفصہ٦ کے پاس موجود نسخے کو منگواکر باقی تمام نسخوں کو تلف کرکے اسے جاری کیا۔ اس کارنامہ کی وجہ سے انہیں جامع قرآن یعنی قرآن جمع کرنے والے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ بڑے مالدار آدمی تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اپنے مال کا بیشتر حصہ یتیموں، بیواؤں اور رشتہ داروں کی پرورش میں خرچ کردیا۔ بہت سارے غلاموں کو ان کے آقاؤں سے خرید کر آزاد کروایا وہ شرم و حیا کے نمونہ (Model) تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت عثمان کی حیا سے فرشتے بھی شرماتے ہیں۔ آپ نہایت نرم دل انسان تھے۔ آپ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس لئے آپ نے انہیں بڑے بڑے عہدے دیئے جس کی وجہ سے لوگوں نے ان کی شکایت کی۔ حضرت عمر٦ اس معاملے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ وہ حضرت علی٦ اور آپ سے کہا کرتے تھے کہ اگر آپ میں سے کوئی خلیفہ ہو جائے تو وہ اپنے قبیلے والوں کو مسلمانوں کے سروں پر مسلط نہ کرے۔ لیکن حضرت عثمان٦ ایسا نہ کرسکے۔ بلکہ انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدے دیئے اور آپ کی نرم دلی سے آپ کے رشتہ داروں نے غلط فائدہ اٹھاکر آپ کو کمزور کردیا۔ خاص طور پر آپ کے رشتہ دار اور کاتب مروان بن حکم نے آپ کی حکومت کا ناجائز فائدہ اٹھاکر آپ کے خلاف بغاوت کرنے کا موقع

فراہم کیا اور شریروں کی ایک ٹولی نے آپ سے خلیفہ کے عہدے سے استعفیٰ دینے کی مانگ کی۔ لیکن خلیفہ نے استعفیٰ دینے سے انکار کردیا۔ یہاں تک کہ ان شورش پسندوں نے آپ کو شہید کردیا۔

خلیفہ چہارم حضرت علی٦

حضرت عثمان٦ کی شہادت کے بعد شورش پسند باغیوں نے حضرت طلحہ٦، حضرت زبیر٦ اور حضرت علی٦ سے خلیفہ کا عہدہ قبول کرنے کے لئے کہا لیکن ان میں سے ہر ایک نے خلافت کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا۔ آخر کار اہل مدینہ حضرت علی٦ کے پاس گئے اور انہیں خلافت قبول کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ مسجد نبوی میں اجتماع ہوا اور مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے اپنے دور حکومت میں بڑی خدمات انجام دیں۔ آپ نے دس برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ نے جنگوں میں جس دلیری اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ اس پر آپ کو مختلف خطابات سے نوازا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حیدرؔ کا خطاب دیا اور ایک تلوار تحفے میں دی۔ جس کو ذلفقار کہتے تھے۔ اسی تلوار کے نام پر آپ کو ذلفقار علی نام پڑا۔ جس طرح حضرت ابو بکر٦ صدیق اکبر، حضرت عمر٦ ، فاروق اعظم اور حضرت عثمان٦، عثمان غنی کہلاتے ہیں۔ اسی طرح آپ علی مرتضٰے کہلاتے ہیں۔

آپ کی خلافت کا آغاز بڑی مشکلات اور پیچیدہ حالات میں ہوا۔ خلیفہ بننے کے بعد آپ کا پہلا کام حضرت عثمان کے قاتلوں کو سزا دینا تھا۔ لیکن آپ کے قاتل اور فسادی ہزاروں کی تعداد میں آپ کی فوج میں شامل ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے آپ فوری طور قاتلوں سے قصاص نہ لے سکے۔ لیکن ان کی اس مجبوری کو بہت سے مسلمانوں نے نہ سمجھا۔ اس لئے وہ بغاوت پر اتر آئے۔ ان بغاوت کرنے والوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ام المؤمنین حضرت عائشہ٦ کے علاوہ حضرت زبیر٦ اور حضرت طلحہ٦ جیسے بزرگ صحابہ شامل تھے۔یہ لوگ حضرت عائشہ کی قیادت میں فوج لے کر بصرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں ان کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی جب دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور لڑائی شروع ہوئی۔ تو حضرت علی٦ کو اس لڑائی میں فتح ہوئی۔ انہوں نے حضرت عائشہ٦ کو اَم المؤمنین کی حیثیت سے مدینہ واپس بھیجدیا۔یہ لڑائی جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ٦ جمل یعنی اونٹ پر سوار تھیں۔ اس جنگ کے بعد حضرت علی٦ مدینہ واپس تشریف نہ لائے بلکہ کوفہ کو دارالخلافہ بنا کر اپنی خلافت کو جاری رکھا۔ جنگ جمل پہلی جنگ تھی جس میں مسلمانوں

نے آپس میں لڑکر ایک دوسرے کا خون بہایا۔ اکثر مسلمان اس باہمی لڑائی سے بہت رنجیدہ ہوئے بعض نے لڑائی کے بعد دونوں فریقین سے علاحدگی اختیار کر کے خاموشی اختیار کی۔

حضرت عائشہ؆ اور حضرت علی؄ کے درمیان لڑائی تو ختم ہوگئی لیکن شام کے والی امیر معاویہ نے حضرت علی؄ کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اس وجہ سے خلیفہ نے ان کو شام کی ولایت سے معزول کردیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہکر خلیفہ کا حکم ماننے سے انکار کیا کہ پہلے حضرت عثمان کے قاتلوں کا قصاص لیا جائے۔ لیکن خلیفہ نے ملک میں افراتفری اور بدامنی کے پیش نظر معاویہ کی اس تجویز کو نظر انداز کیا۔ جس وجہ سے دونوں کے درمیان صفین کے مقام پر ایک بہت بڑی جنگ ہوئی جس میں دونوں طرف سے ہزاروں مسلمان شہید ہوئے لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ اس جنگ میں حضرت علی؄ کی فوج کامیابی کی منزل پر پہنچ چکی تھی لیکن امیر معاویہ نے جب اپنی شکست کے آثار دیکھے تو انہوں نے قرآن کو نیزوں پر اٹھا کر صلح کرنے کی اپیل کی حضرت علی؄ کے فوجی کمانڈر نے اس اپیل کو تسلیم کیا اور لڑائی بند کردی گئی۔ حضرت علی؄ کی طرف سے ابو موسیٰ اشعری؄ اور امیر معاویہ کی طرف سے عمرو؄ بن عاص حَکم فیصلہ کرنے والے بنائے گئے اور طے پایا گیا کہ یہ دونوں حَکم جو فیصلہ کریں فریقین کو منظور ہوگا۔ دو متہ الجندل کے مقام پر مسلمانوں کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ جس میں دونوں طرف کے منتخب کئے گئے نمائندوں کو اپنے اپنے خلیفہ کو معذول کرنے کا اختیار دیا گیا۔ پہلے حضرت علی کے نمائندے ابو موسیٰ اشعری نے اپنے امیر حضرت علی کو خلافت سے معزول کیا اور اس کے بعد جب امیر معاویہ کے نمائندہ عمر بن عاس اٹھے تو انہوں نے اعلان کردیا کہ ابو موسیٰ اشعری نے اپنے امیر علی؄ کو معزول کردیا۔ لیکن میں اپنے امیر معاویہ کو خلافت کے عہدے پر برقرار رہنے کا اعلان کرتا ہوں۔ اس طرح عمرو بن عاص کے اس نامناسب اعلان کے بعد یہ اجتماع کسی نتیجے تک پہنچنے کے بغیر ختم ہوا اور مسلمان وہاں سے واپس لوٹے۔ اس دوران مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ وجود میں آگیا جو خارجیؔ کہلاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ دینی معاملات میں انسان کو حَکم بنانا کفر ہے اور یہ اقدام قرآن کے خلاف ہے۔ ان لوگوں نے ایک خوفناک منصوبہ بنایا کہ حضرت علی؄ اور حضرت معاویہ؄ دونوں کو قتل کردیا جائے کیونکہ یہ لوگ مسلمانوں میں خانہ جنگی کے ذمہ دار ہیں۔ اس کام کے لئے دو خارجیوں کو منتخب کیا گیا۔ اس کاروائی میں امیر معاویہ تو کسی طرح بچ گئے لیکن حضرت علی؄ کو ابن ملجم نے نماز کے دوران حملہ کرکے شہید کردیا۔

حضرت علیؓ تقریباً ساڑے چار سال خلافت کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کا عہد خلافت خانہ جنگی میں گزرا۔ اس لئے کوئی نیا ملک فتح نہ ہوا ان کا دور حکومت اگرچہ انتشار اور خانہ جنگی میں گزرا لیکن ان کا انتظام سلطنت عادلانہ اور منصفانہ تھا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کی طرح سادہ اور زاہدانہ زندگی گزاری۔ فیصلہ کرتے وقت وہ بڑے سے بڑے آدمی یہاں تک کہ اپنے رشتہ داروں کو رعایت نہیں کرتے تھے اور اپنے آپ کو عام مسلمانوں کے برابر سمجھتے تھے۔ اپنی غلطی کی جوابدہی کے لئے تیار رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک یہودی نے ان کی زِرہ لوہے کی ٹوپی (Helmet) چُرا لی۔ آپ نے اپنی زرہ پہچان لی اور قانون کے مطابق یہودی کے خلاف عدالت میں دعویٰ کیا۔ قاضی نے جب ثبوت مانگا تو وہ ثبوت نہ دے سکے۔ قاضی نے ثبوت نہ ملنے پر یہودی کے حق میں فیصلہ سنا دیا تو آپ نے خاموشی اختیار کر کے فیصلہ قبول کیا۔ اس فیصلے کا یہودی پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کیا اور کہا کہ یہ تو نبیوں جیسا انصاف ہے۔ آپ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کیا جب آپؓ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنا ولی عہد مقرر کیوں نہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کو اسی حالت میں چھوڑنا چاہتا ہوں جس میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انتقال کے وقت چھوڑا تھا۔ آپؓ کی وفات کے بعد کوفہ کے لوگوں نے امام حسن کو خلیفہ منتخب کیا لیکن انہوں نے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہونا پسند کیا۔ اس طرح آپ کی بے مثال قربانی نے مسلمانوں کو خانہ جنگی سے نجات دلائی۔ آپؓ کی اس خلافت کی دست برداری کے سال کو عام الجماعہ یعنی اتحاد و اتفاق کا سال کہا جاتا ہے۔ خلافت سے دست بردار ہونے کے بعد آپؓ کوفہ چھوڑ کر مدینہ آگئے اور وہیں اس معاہدہ کے نو سال بعد 50ھ میں وفات پائی۔ آپ کی خلافت صرف چھ (6) ماہ کی مدت تک قائم رہی۔

حضرت امیر معاویہؓ

حضرت علی٦ کی شہادت کے ساتھ ہی خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا اور خلافت بادشاہت (Kingdom) میں تبدیل ہوگئی۔ امیر معاویہ اس بادشاہی دور کے پہلے حکمران تھے۔ انہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام لایا اور صرف تین سال نبیؐ کی صحبت میں رہے۔ وہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے حضرت علی٦ سے لڑپڑے اور بڑے بڑے صحابہ کی رائے کو ٹھکراکر اپنی زندگی میں ہی اپنے بڑے بیٹے یزید کو خلیفہ نامزد کیا۔ وہ خلفائے راشدین کی سادہ زندگی کے بجائے شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے اور بیت المال سے اپنی مرضی کے مطابق بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے تھے۔ وہ شاہی دربار میں ایک شہنشاہ کی طرح ہوتے تھے اور ایک عالیشان تخت پر بیٹھ کر حکومت کرتے تھے۔ وہ ایک شاندار محل میں زندگی گزارتے تھے اور اس طرح کی زندگی گزارنے پر انہیں حضرت عبداللہ بن عمر سخت تنقید کرتے تھے۔ وہ رائے عامہ کے پابند نہ تھے اور کہتے تھے کہ جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا ہوں اور جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا ہوں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود انہیں عدل و انصاف کا بڑا خیال رہتا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے بیس (20) سال تک امن و امان کے ساتھ حکومت کی۔ وہ نرم مزاج بادشاہ تھے کسی کے ساتھ بلاوجہ سختی نہیں کرتے تھے۔ اپنے مخالفین کو بھی مالی مدد کرکے خوش رکھتے تھے۔ حضرت حسن٦ اور حضرت حسین٦ اور ان کے خاندانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے اور ان کی مالی مدد بھی کرتے تھے۔ انہوں نے رفاہِ عام کے بڑے بڑے کام کئے۔ وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے ڈاک خانہ (Post Office) کا نظام قائم کیا جس سے خطوط نویسی عام ہوگئی اور لوگوں کو ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچانے میں سہولت ملی۔ ڈاک کا یہ کام گھوڑ سواروں کے ذریعے انجام دیا جاتا تھا۔

بادشاہ ہونے کی حیثیت سے حضرت معاویہ ایک کامیاب حکمران تھے اور ان کی صرف ایک خامی تھی کہ انہوں نے خلافت کے بجائے ملوکیت یعنی بادشاہت قائم کی دراصل ان کے دور حکومت کی خامیاں ان کی ملوکیت کے اِستبدادی نظام، مَطلق العنان حکومت کی فطری خامیاں تھیں نہ کہ ذاتی خامیاں خلافت راشدہ کے بعد تاریخ اسلام میں ان کا دور حکومت ایک مثالی دور تھا۔

خانہ جنگی اور کربلا کا واقعہ

امیر معایہ٦ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے یزیدؔ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں خلیفہ کا انتخاب صحابہ کے مشورے سے کیا جاتا تھا اور کسی خلیفہ نے اپنے بیٹے کو خلیفہ نہیں بنایا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ خلافت خلیفہ کی ملکیت نہیں ہوتی ہے جو باپ کے بعد بیٹے کی وراثت میں آجائے۔ خلافت اور حکومت ملک کا انتظام چلانے کے لئے بنائی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور قول ہے کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔ اس لئے سرداری کا یہ کام ان لوگوں کو سونپنا چاہئے جو اس کے لائق ہوں۔ لیکن امیر معاویہ٦ نے بڑے بڑے باصلاحیت لوگوں کو نظر انداز کر کے اپنے لڑکے یزیدؔ کو جو لوگوں کی نظروں میں قابل اعتماد نہ تھا اپنا جانشین مقرر کردیا۔ اگرچہ انہوں نے ان کی جانشینی کے بارے میں کچھ ممتاز لوگوں سے مشورہ کیا تھا اور حج کے موقع پر ہزاروں لوگوں نے یزید کی بیعت لی۔ لیکن یہ بیعت ایک دباؤ کے تحت کی گئی تھی کیونکہ امیر معاویہ خلیفہ وقت ہر حال میں اپنے بیٹے کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ جن لوگوں نے اس بیعت کی مخالفت کی ان میں حضرت حسین٦، حضرت عبداللہ بن عمر٦، حضرت عبداللہ بن عباس٦، حضرت عبداللہ بن زبیر٦ اور حضرت عبدالرحمان بن ابوبکر٦ کے نام نمایاں تھے۔ ان لوگوں نے صاف کہدیا کہ اس طرح کی تخت نشینی سے اسلام کی تاریخ میں ایک سیاسی بدعت کی بنیاد ڈالدی گئی۔ جس سے ملوکیت کا نظام مستحکم ہوگیا۔ موجودہ دور کے ایک عظیم محقق سید ابوالاعلیٰ مودودی٧ نے اپنی کتاب خلافت و ملوکیت میں لکھا ہے کہ ''اس کے بعد ملوکیت کا یہ نظام ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفٰے کمال کی خلافت تک ایک دن کے لئے بھی اس میں تنزل واقع نہیں ہوا۔ جبری بیعت اور خاندانوں کی موروثی بادشاہت کا ایک مستقل طریقہ چل پڑا۔ لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسر اقتدار آتے رہے۔ بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت ہونے لگی۔ بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قابض ہونے اور قابض رہنے کے لئے شرط نہ رہا۔ لوگوں کی اول تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھوں میں اقتدار آیا ہوا تھا اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو اس کا نتیجہ ہرگزیہ نہ ہوتا کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا ہو وہ ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے ہٹ جائے۔'' (بحوالہ خلافت و ملوکیت)

خلافت یزید کے ہاتھوں میں

امیر معاویہ؆ کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا یزید خلیفہ ہوا لیکن بہت سارے لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اس طرح کا جانشین کو قیصر و کسریٰ کا طریقہ سمجھتے تھے۔ جو اسلامی طریقہ کے برخلاف تھا اور لوگ یزید کو کردار کے لحاظ سے بھی خلیفہ بنانے کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ مخالفت میں حضرت حَسین بھی شامل تھے۔ عراق میں کوفہ کے لوگوں نے حضرت حسین؆ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تاکہ انہیں خلیفہ بنایا جائے۔ ان کے حامیوں نے انہیں کوفہ نہ جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن انہوں نے اس مشورے کو نظرانداز کردیا اور کوفہ والوں کی دعوت پر اپنے خاندان کے بہتر (72) آدمیوں کے ساتھ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے مکہ سے کوفہ روانہ ہوگئے۔ کوفہ میں یزید نے عبداللہ بن زیاد کو گورنر مقرر کیا تھا۔ جب کوفہ میں حضرت حسین؆ کے آنے کی خبر پہنچی تو ابن زیاد کے چار ہزار آدمیوں نے کربلا کے مقام پر اس قافلے کو روک لیا اور حضرت حسین؆ کو یزید کی بیعت کرنے کے لئے کہا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ یا تو انہیں یزید کے پاس جانے دیا جائے تاکہ وہ خود ان سے معاملہ طے کریں یا پھر ان کو مدینہ واپس جانے دیا جائے۔ لیکن ابن زیاد نے ان کی کوئی شرط قبول نہ کی اور انہیں یزید کی بیعت کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے جبر اور زور و زبردستی کے آگے جھکنے کے بجائے جان دینا قبول کرلیا اور مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوئے لیکن مقابلہ بے جوڑ تھا۔ چند لوگ چار ہزار ہتھیاربند لوگوں کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت حسین اور ان کے ساتھی شہید ہوگئے۔ ابن زیاد نے حضرت حسین کا سر کاٹ کر عورتوں اور بچوں پر مشتمل ان کے قافلے کو یزید کے پاس دمشق بھیجدیا۔

کربلا کا یہ واقعہ تاریخ اسلام کا ایک افسوس ناک واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کو اپنے چند ساتھیوں سمیت وحشیانہ طریقے سے قتل کردیا گیا۔ حجاز میں اس واقعہ پر سخت رد عمل ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے یزید کی بیعت توڑکر حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یزید نے اس کاروائی کو دبانے کے لئے مدینہ کی طرف فوج بھیجدی جس نے مدینہ فتح کرکے شہر میں قتل عام کیا۔ یزید کے انتقال کے بعد امیر معاویہ کے خاندان کی حکومت ختم ہوگئی کیونکہ یزید کے بیٹے نے حکومت قبول کرنے سے انکار کیا اور کوئی خلیفہ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان انتشار کا شکار ہوگئے۔ لیکن بعد میں انہوں نے عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس طرح مصر، شام، عراق سمیت پوری اسلامی خلافت عبداللہ بن زبیرؓ کے تحت آگئی لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی عبداللہ بن زبیرؓ اور بنی امیہ کے حامیوں میں ایک سخت جنگ ہوئی جس میں بنی امیہ کو کامیابی ملی اور شام سے عبداللہ بن زبیر کا اقتدار ختم ہوگیا۔ لیکن باقی دنیائے اسلام کے بڑے حصے پر سات سال تک ان کا اقتدار قائم رہا۔ لیکن اس دوران بنی امیہ کے حامی زور پکڑتے گئے یہاں تک کہ مکہ پر ان کا قبضہ ہوگیا اور عبداللہ بن زبیر بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے اور ان کے شہادت کے ساتھ ہی نظامِ خلافت کی امید بھی ختم ہوگئی۔

عبدالملک (65تا 86ہجری)

یزید کے انتقال کے بعد جو لوگ خلیفہ ہوئے وہ امیر معاویہ کی اولاد میں سے نہیں تھے۔ لیکن وہ بنی امیہ کے خاندان سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ مروان بن حکم بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ حضرت عثمان کے سیکریٹری (Secretory) رہ چکے تھے اور یہی حضرت عثمان کی مشکلات کے ذمہ دار تھے۔ جب مدینہ میں عبداللہ بن زبیر کی حکومت قائم ہوگئی تھی تو مروان شام چلے گئے تھے جہاں بنی امیہ کے لوگوں نے انہیں خلیفہ بنالیا۔ لیکن وہ صرف نو ماہ کی حکومت کرکے 65ھ میں انتقال کرگئے اور ان کی جگہ ان کے لڑکے عبدالملک کو خلیفہ بنایا گیا۔ وہ 39 سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ ان کا شمار مدینہ کے ممتاز علما میں ہوتا تھا۔ وہ باہمت اور مستقل مزاج آدمی تھے۔ عبداللہ بن زبیر کے بعد وہ پوری اسلامی مملکت کے حکمران بن گئے۔ شروع میں ان کو کئی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کے عہد میں شمالی افریقہ جو مسلمانوں کے ہاتھ سے چلا گیا تھا دوبارہ فتح ہوا۔ انہوں نے دفتروں میں عربی زبان کا استعمال لازمی قرار دیا۔ انہوں نے غیر ملکی سکے کا داخلہ بند کرکے اپنے ملک میں اسلامی سکہ جاری کردیا۔

ولید بن عبدالملک (86تا 96ھ)

ولید بن عبدالملک کا دور حکومت فتوحات کے لئے مشہور ہے۔ ان کے فتوحات سے حضرت عمرؓ کے زمانے کی یاد آتی ہے۔ ولید کے سپاہ سالار قتیبہ نے بخارا، سمرقند اور کاشغر فتح کرکے اسلامی حکومت کی حدود چین تک بڑھادی۔ جب کاشغر فتح کرکے وہ چین کے سرحد پر پہنچ گئے اور چین سے مسلمانوں کی جنگ ہونے والی تھی تو اسی دوران خلیفہ ولید کا انتقال ہوگیا اور نئے منتخب خلیفہ نے چین کی سرحد سے اپنی فوج کو واپس بلایا جس کی وجہ سے چین فتح نہ ہوسکا۔ ان کے زمانے میں اسپین اور پرتگال (اندلس) پر لشکر کشی کی گئی۔ اس جنگ میں فوج کی قیادت طارق بن زیاد کر رہے تھے۔ انہوں نے بارہ ہزار فوج کی قیادت کرکے ایک لاکھ سے زائید فوج کو شکست دے دی اور پورے اندلس کو فتح کرکے فرانس کی حدود تک پہنچ گئے۔یہاں سے قسطنطنیہ کو فتح کرکے شام کی سرحد پر ڈھیرہ ڈالا۔ لیکن خلیفہ نے آگے بڑھنے نہ دیا۔ اگر فوج کو روکا نہ جاتا تو پورا یورپ مسلمانوں کے قبضے میں آجاتا۔ ان لڑائیوں میں مسلمانوں نے رومیوں سے کئی علاقے چھین لئے۔ ان فتوحات کے بعد دس سال کے عرصہ میں ولید

لی اسلامی حکومت عروج پر پہنچ گئی کہ اتنی بڑی سلطنت دنیا میں اب تک قائم نہیں ہوئی تھی۔ کاشغر سے بحر اوقیانوس تک پانچ ہزار میل کے فاصلے تک مسلمانوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔

ولید کے زمانے میں بہت سے تعمیراتی کام بھی ہوئے انہوں نے مسجد نبویؐ کی دوبارہ تعمیر کرکے اسے بڑھاکر ایک خوبصورت مسجد بنادی۔ دارالحکومت دمشق میں بھی ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی جو جامع اموی کہلاتا ہے۔ اس مسجد کو دیکھ کر روم کے ایک تجربہ کار نے کہا کہ ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا عروج چند دنوں کا ہے لیکن اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان ایک دیرپا زندہ رہنی والی قوم ہے۔ ان کے زمانے میں خلفائے راشدین کے بعد رفاہ عام کے جو کام ہوئے وہ قابل تعریف ہیں۔ انہوں نے سڑکیں بنوائیں اور مسافروں کی سہولت کے لئے جگہ جگہ مہمان خانے قائم کئے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے بھیک مانگنے پر روک لگادی تھی اور معذور اپاہج لوگوں کے لئے وظیفے مقرر کئے اور اندھوں کی رہنمائی کے لئے مددگار (Guide) مقرر کئے۔ انہوں نے یتیموں لی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ علما اور فقہا کے وظیفے مقرر کئے تاکہ وہ اطمینان سے لوگوں کو تعلیم دیں اور ان کے دنیاوی مسائل حل کریں۔

ولید اگرچہ سخت گیر حکمران تھے لیکن ان کے مذکورہ کارنامے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ ایک باصلاحیت اور باوقار منتظم (Administrator) تھے اور وہ رعایا کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ذاتی طو رپر ان کی زندگی میں مذہبی رنگ تھا وہ خود بھی قرآن پڑھتے تھے اور قرآن خوانوں کی قدر کرتے تھے اور قرآن حفظ کرنے والوں کو وظیفے اور عطئے دیتے تھے۔

سلمان بن عبدالملک

ولید بن عبدالملک کے بعد ان کے بھائی سلمان بن عبدالملک خلیفہ بن گئے۔ انہوں نے اگرچہ صرف ڈھائی سال حکومت کی لیکن انہوں نے اپنے دور حکومت میں خلافت کو وسیع کرنے کی بڑی کوشش کی۔ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا گیا اس مہم کے سربراہ سلمان کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک تھے جنہوں نے رومیوں کے ساتھ جنگیں لڑکر شہرت حاصل کرلی۔ اس جنگ کے دوران مسلمانوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن مسلمانوں نے ہمت نہ ہاری اور قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے قریب تھے کہ سلمان کا انتقال ہوگیا اور نئے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے جو امن کے خواہشمند تھے، فوج کو واپس بلایا سلمان ایک دین دار اور باصلاحیت حکمران تھے۔ انہوں نے اپنے دور حکومت میں ان زیادتیوں کی تلافی کرنے لی کوشش کی جو ولید کے دور میں حجاج اور دوسرے حاکموں کی وجہ سے لوگوں کو اٹھانا پڑی تھیں۔ خیر کے ان کاموں کی وجہ سے انہیں مفتاحَ الخیر یعنی بھلائی کی کنجی کے لقب سے پکارا گیا۔ ان کے نیک کاموں میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز جیسی نیک ہستی کو اپنا جانشین مقرر لیا۔ حالانکہ شاہی خاندان کے اہم لوگ اور ان کے حقیقی بھائی اور لڑکے موجود تھے خلیفہ کی خواہش تھی کہ ایسے صالح شخص کو خلیفہ بنایا جائے جو نیک اور باصلاحیت اور انصاف پسند ہو۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز

فتوحات اور رفاہِ عام کے کاموں میں اگر کوئی حکمران عظیم کہلانے کے مستحق ہیں تو وہ عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ انہوں نے صرف دو سال پانچ ماہ حکومت کی لیکن اس مختصر مدت میں خلفائے راشدین کی یادتازہ لی۔ خلیفہ بننے سے پہلے وہ بڑے عیش و آرام کی زندگی گزارتے تھے اور بڑے نازک مزاج تھے۔ اپنے زمانہ کے بہترین اور پسندیدہ لباس پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ جو لباس پہنتے وہ دوبارہ نہیں پہنتے۔ لیکن خلیفہ بننے کے بعد ان کی زندگی یکسر بدل گئی کہ شان و شوکت سے منہ موڑلیا اور سادہ زندگی اختیار کرلی۔

امیر معاویہؓ، عبدالملک اور ولید بن عبدالملک اگرچہ اچھے اور قابل حکمران تھے لیکن ان کی حکومتوں میں لوگوں سے زیادتیاں بھی ہوئیں۔ حضرت معاویہؓ کی حکومت خلافت سے بادشاہت میں تبدیل ہوگئی تھی اور خلیفہ ان ہی کے خاندانوں سے چن لیا جاتا تھا۔بیت المال کو یہ لوگ اپنا مال سمجھتے تھے اور اسے زیادہ تر اپنے رشتہ داروں اور حامیوں میں تقسیم کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز نے سب سے پہلے اس ظلم کو ختم کر ڈالا۔ جابر اور ظالم عہدہ داروں کو ان کے عہدوں سے ہٹادیا اور بیت المال کو رعایا کی ملکیت بنادیا۔ جس سے صرف مستحق لوگوں کی مدد کی جاتی تھی۔ اگرچہ آپ دستور کے مطابق خلیفہ بن چکے تھے لیکن انہوں نے سرعام اعلان کرکے خلافت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن لوگوں نے آپ کی دست برداری کو قبول نہ کیا اور آپ کو اتفاق رائے سے خلیفہ منتخب کرلیا۔ جب آپ کو یقین ہوگیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے اختلاف نہیں تو آپ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کرلی۔

خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت کے دور میں یہ پہلی اور آخری کوشش تھی کہ خلافت کو دوبارہ قائم کر کے اسلام کی بالادستی قائم کی جائے۔ آپ نے نہ صرف بیت المال کو ناجائز مَصارف سے بچایا بلکہ شاہی خاندان والوں سے وہ سب بڑی بڑی جاگیریں اور جائیدادیں جو انہیں ناجائز طور پر حاصل ہوئی تھیں واپس لے لیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے اپنی ذاتی جاگیر واپس کردی اور شاہی خاندانوں کے وظیفے عام لوگوں کے وظیفوں کے برابر کردیا۔ حالانکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی خاندان کے لوگ آپ کے مخالف ہوگئے۔ آپ خلفائے راشدین کی طرح اپنے لئے بیت المال سے صرف اتنی رقم لیتے تھے جو زندگی گزارنے کے لئے ضروری تھا۔ آپ کی پرہیزگاری کے بہت سے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ چراغ کی روشنی میں سرکاری کام کررہے تھے کہ ایک شخص ان سے ملنے آیا کام چونکہ ذاتی تھا اس لئے آپ نے چراغ بجھادیا اور اندھیرے میں باتیں کرنے لگے۔ اس شخص نے جسب وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا کہ یہ سرکاری چراغ ہے اور ہم نجی بات کرہے ہیں۔ اس لئے اس دوران بیت المال کا چراغ جلانا جائز نہیں ہے۔ اس طرح ایک مرتبہ بیت المال میں آئے سیب تقسیم ہو رہے تھے تو ان کے ایک بچے نے سیب اٹھایا لیکن آپ نے ان کے ہاتھ سے یہ کہکر سیب چھین لیا کہ یہ بیت المال کا سیب ہے۔ حجاج بن یوسف کے جابرانہ طرز حکومت کو آپ ناپسند کرتے تھے۔ آپ نے جبر و ظلم کے بجائے انصاف کو کامیاب حکومت کی کنجی قرار دیا۔ اموی دور میں شک و شبہ کی بنیاد پر سزا دی جاتی تھی۔ آپ نے اس طریقہ کار کو بند کردیا اور حکم جاری کیا کہ صرف شرعی ثبوت پر ملزم کو سزا دی جائے۔ عدل و انصاف کے معاملے میں آپ مسلم اور غیر مسلم میں فرق نہیں کرتے تھے۔ آپ غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کرتے تھے کوئی مسلمان ذمیوں کے مال پر دست درازی نہیں کرسکتا تھا۔ آپ کے عدل و انصاف کا یہ نتیجہ نکلا کہ آپ کے دور حکومت میں غیر مسلم کثرت سے اسلام قبول کرکے ملت اسلامیہ میں شامل ہوگئے۔ سندھ میں تیزی سے اسلام پھیلا۔ یہاں تک کہ راجہ داہر کے بیٹے جے سنگھ نے اسلام قبول کیا۔ آپ نے شراب کی خرید و فروخت مکمل طور پر بند کردی اور عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم دیا۔ ملک میں آپ نے بہت سے تعمیری کام کئے اور اصلاحات کیں۔ رفاہ عام کے ان کاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ملک میں خوشحالی عام ہوگئی یہاں تک کہ کوئی صدقہ اور بھیک مانگنے والا نہ ملتا تھا۔

ان انقلابی اصلاحات پر ملوکیت کو پسند کرنے والے شاہی خاندان کے لوگ ان سے ناراض ہوئے کیونکہ ان کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ آپ خاندانی بادشاہت ختم کردیں گے۔ ان خطرات کے پیش نظر انہوں نے آپ کو زہر دے کر ہلاک کردیا۔ آپ نے 39 سال کی عمر میں وفات پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یزید بن عبدالمالک یزید ثانی

عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد یزید بن عبدالملک کو خلیفہ بنایا گیا جو یزید ثانی بھی کہلاتے تھے۔ شروع میں انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور ان کے اصلاحات کو قائم رکھا لیکن ان سے یہ کام نہ ہوسکا۔ انہیں محسوس ہوا کہ عمر بن عبدالعزیز کی طرح خلافت کا کام چلانا لوہے کے چنے چبانے کے برابر ہے۔ اس لئے ہمت ہار کر انہوں نے چالیس دن کے بعد ہی تمام اصلاحات کو منسوخ کرکے وہی پرانا استبدادی نظام دوبارہ قائم کردیا۔ چار سال چار ماہ حکومت کرنے کے بعد ان کا انتقال ہوگیا اور ان کے بھائی ہشام بن عبدالملک خلیفہ بن گئے۔

ہشام بن عبدالملک

ہشام بن عبدالملک نے بیس (20) سال تک حکومت کی وہ بنی امیہ خاندان کے آخری بڑے حکمران تھے۔ وہ بڑے پاکباز، منتظم، کفایت شعار اور باصلاحیت حکمران تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں امیر معاویہ کا تدبر اور عبدالملک کی اولعزمی ایک ساتھ جمع تھیں۔ ان کے انصاف کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بیت المال میں اس وقت تک آمدنی کی رقم داخل نہ کرتا جب تک کہ یہ شہادت نہ ہوتی کہ یہ رقم جائز طریقے سے حاصل کی گئی ہے۔ وہ بڑے انصاف پسند حکمران تھے۔ ان کے عہد حکومت میں کئی نئے شہر آباد ہوئے۔ ان کے عہد حکومت خراسان، ترکستان، آرمینیہ، آزربیجان اور شمالی افریقہ میں بغاوتیں ہوئیں لیکن انہوں نے ان سب بغاوتوں کو کامیابی سے ناکام کردیا۔ ایشائے کوچک میں رومیوں کے ساتھ ان کی لڑائیاں ہوئیں ان کی فوجی مہمات میں اندلس کے والی

عبدالرحمان نے فرانس پر حملہ کیا مسلمانوں کا یورپ کی متحدہ فوج سے مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں سپاہ سالار عبدالرحمان شہید ہوگئے اور مسلمان فوجیں غذا کی کمی کی وجہ سے واپس آگئیں۔

ولید بن یزید ولید ثانی

ہشام بن عبدالملک کی وفات کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک جو ولید ثانی کہلاتے تھے حکمران بن گئے۔ وہ ایک ناقابل اور عیاش حکمران تھے۔ ان کی زندگی میں تضاد تھا وہ شراب بھی پیتے تھے اور نماز بھی پابندی سے پڑھتے تھے۔ ان کی نا اہلی کی وجہ سے عربوں میں ناراضگی ہوئی اور لوگوں نے ان کے خلاف کاروائی کی جب لوگ ان کو قتل کرنے کے لئے محل خانے میں داخل ہوئے تو انہوں نے قرآن کی تلاوت شروع کی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں حضرت عثمان کی طرح قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید ہوجاؤں۔ اسی دوران لوگوں نے اسے قتل کر ڈالا۔

یزید بن ولید ۔ یزید ثالث یعنی تیسرا یزید

یزید بن ولید المعروف یزید ثالث عابد اور زاہد انسان تھے۔ انہیں یزید الناقص بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ پورے ایک سال تک حکومت نہ کرسکے۔ انہوں نے خلافت کو اسلامی رنگ دینے کے عزم کا اظہار کیا تھا لیکن ان کی خلافت ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھی کہ ان کے مقابلے میں دعویدار کھڑے ہوگئے۔ حکومت سنبھالنے کے چھ (6)ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا اور ان کے بھائی ابراہیم بن ولید خلیفہ بن گئے۔

ابراہیم بن ولید

ابراہیم بن ولید کے خلیفہ بننے کے بعد شاہی خاندان کے افراد کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ شہزادہ مروان بن محمد جو عبدالملک کے بھتیجے تھے نے صرف چار مہینوں میں ابراہیم کی حکومت ختم کردی اور خود حکمران بن بیٹھے۔

مروان بن محمد

مروان بن محمد جنہیں مروان ثانی یعنی تیسرا مروان بھی کہتے ہیں۔ الحمآر کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ

ایک قابل، تجربہ کار اور دلیر انسان تھے۔ ترکوں کے خلاف لڑائیوں میں انہوں نے اپنی فوجی قابلیت کا اچھا ثبوت دیا۔ لیکن سلطنت کے اندرونی حالات اتنے بگڑ گئے کہ ان پر قابو نہ پاسکا۔ خاندانی اختلافات بڑھ گئے۔ عرب یمنی اور مصری قبائل کے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ایک دوسرے کے قاتل بن گئے۔ سلطنت میں ہر جگہ بغاوتیں شروع ہوگئیں جن میں خطرناک بغاوت بنی ہاشم کی تھی۔ بنی ہاشم چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے تھے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو بنی امیہ کے بالمقابل خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے اور دوسرے گروہ کے لوگ حضرت عباس کی اولاد کو خلافت دلانا چاہتے تھے۔ شروع میں دونوں گروہوں کے لوگوں نے ملکر بنی امیہ کی حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن بعد میں عباسی گروہ کے لوگ غالب آ گئے۔

عباسی دور. بغداد کا عروج

عبداللہ بن محمد المعروف سفاح

(132ھ تا 136ھ مطابق 750ئ تا 754ئ) عبداللہ بن محمد المعروف ابوالعباس سفاح عباسی دور کے پہلے خلیفہ تھے۔ انہوں نے چار سال تک حکومت کی۔ ان کا سارا زمانہ مخالفوں کو دبانے اور نئی حکومت کو مضبوط کرنے میں گزرا۔ انہوں نے بغداد میں ہاشمیہ کے نام سے ایک نیاشہر تعمیر کیا وہ ایک مدبر اور با اخلاق آدمی تھے۔ لیکن ان کے ظلم و ستم نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔ ان کے دست راست ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کے لاکھوں لوگوں کا قتل عام کیا۔ حضرت معاویہؓ سمیت تمام اموی حکمرانوں کی قبریں کھودڈالی گئیں ہشام بن عبدالملک کی لاش قبر میں صحیح سلامت ملی تو اس کو کوڑوں سے پیٹا گیا۔ بنی امیہ کا بچہ بچہ قتل کیا گیا اور اموی سرداروں کی تڑپتی لاشوں کو گھسیٹا گیا یہی وجہ ہے کہ ان کو سفاح یعنی خونریزی کرنے والا کا لقب دیا گیا۔ جنگ تالاس ان کے زمانے کا مشہور جنگ ہے یہ جنگ ترکستان کی مشرقی سرحد پر عربوں اور چینیوں (Chineese) کے درمیان 751ئ میں ہوئی چینیوں نے مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر ترکستان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام ہوئے ۔ اس کے بعد مسلمانوں نے چین پر کوئی فوج کشی نہ کی۔

ابو جعفر منصورؒ

(136ھ تا 158ھ مطابق 754ئ تا 775ئ)

ابو جعفر منصور اپنے بھائی ابو العباس سفاح کے بعد تخت نشین ہوئے انہوں نے بائیس (22) سال حکومت کی اور عباسی خلافت کو مضبوط کیا۔ وہ بڑے قابل حکمران تھے۔ مخالفوں کے ساتھ سختی کرتے تھے لیکن عام لوگوں کے لئے وہ عادل بادشاہ تھے۔ اپنا سارا وقت سلطنت کے کاموں پر صرف کرتے تھے۔ انہوں نے فرمان جاری کیا کہ جس کسی کو میری حکومت کے حاکم سے کوئی تکلیف پہنچے وہ بلا روک وٹوک مجھ سے اس کی شکایت کرے۔ وہ خود سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایسی زندگی گزارتے تھے کہ ان کے کپڑے پر پیوند لگے ہوتے تھے۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بغداد شہر کی بنیاد ڈالی۔ چونکہ خلفائے راشدین کا دارالخلافہ مدینہ تھا اور بنی امیہ نے دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا تو انہوں نے اپنے اس نئے آباد کئے ہوئے شہر بغداد کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس شہر نے ایسی ترقی کی کہ وہ دنیا کا ایک بڑا مشہور شہر بن گیا۔ انہوں نے اس شہر میں مسجدیں تعمیر کروائیں اور سڑکیں بنوائیں۔ ان کے زمانے میں عباسی حکومت کو بڑی وسعت ملی۔ ان کے عہد حکومت میں حضرت علی کی اولاد کی طرف سے خلافت حاصل کرنے کی کوشش میں بغاوت ہوئی لیکن یہ بغاوت ناکام ہوئی۔ ان کے دور خلافت میں رومیوں سے دوبارہ لڑائیاں شروع ہوگئیں جن میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ 155ھ میں انہوں نے قیصر روم سے جزیہ وصول کرنے کا معاہدہ کیا۔ ان کے دور حکومت میں علم و ادب نے بہت ترقی کی اور تصنیف و تالیف کا کام باقاعدگی سے شروع ہوگیا۔ انہیں خود بھی علم کی اشاعت سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے دربار میں ہر علم و فن کے علما موجود تھے اور ان کی حکومت کے دوران ریاضی، طب اور فلسفہ کے علوم نے بہت ترقی کی۔ مسلمان علمی میدان میں آگے بڑھے۔ امام مالک کی احادیث کی مشہور کتاب ''موطا'' اسی زمانے میں لکھی گئی اور امام ابو حنیفہ کے فقہ اسلامی کو اسی دور میں تحریری صورت میں مرتب کیا گیا اور اسی عہد میں ابن اسحاق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی مکمل سوانح عمری مرتب کی۔

محمد مہدی

(158ھ تا 169ھ مطابق 755ئ تا 766ئ)

ابو جعفر منصور کے بعد ان کے بیٹے محمد مہدی خلافت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ نرم دل، عیش پرست اور رنگین مزاج آدمی تھے۔ لیکن عیش پرستی کے باوجود وہ باکردار اور فرض شناس بادشاہ تھے۔ انہوں نے منصور کے عہد حکومت میں ظلم کا نشانہ بنے ہوئے لوگوں سے نیک سلوک کیا اور ظلم و جبر کرکے ان سے جو مال چھینا گیا تھا وہ انہیں واپس کردیا۔ مورخین کے مطابق وہ رعایا میں محبوب تھے۔ مظالم کی روک تھام، قتل وغارت اور خونریزی سے احتراز جیسی خصوصیات نے انہیں لوگوں میں محبوب بنایا۔ انہوں نے بڑے بڑے شہروں میں رسل و رسائل کا بہترین نظام قائم کیا۔ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں توسیع کرائی اور زندیقوں اور ظاہری مسلمانوں کو تربیت کرکے اسلام کے صحیح راستے پر لایا۔

ان کے دس سالہ دور حکوت میں اگرچہ امن و امان رہا لیکن رومیوں سے سرحدی جھگڑے جاری رہے۔ ان کی فوجیں رومی دارالحکومت قسطنطنیہ تک پہنچ گئی اور رومی حکومت کو سالانہ خراج دینے پر مجبور کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے رومیوں سے خراج لینے کے بجائے ان پر چڑھائی کی ہوتی تو روم اسلامی سلطنتوں میں شامل ہوتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ مسلمانوں نے خراج لینے کو حکومت کرنے پر ترجیح دی۔

ہادی محمد

(169تا 170ھ مطابق 785تا 786ئ)

محمد ہادی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ہادی محمد تخت نشین ہوئے حضرت علی کی اولاد میں بعض لوگ خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ عباسیوں کے خلاف ہوئے۔ محمد ہادی کے دور حکومت میں ان میں سے ادریس نام کے ایک شخص حجاز سے نکل کر مراکش چلے گئے اور وہاں ایک خود مختار حکومت کی بنیاد ڈالی جو 785ئ سے لے کر 920ئ تک 135 سال قائم رہی۔ یہ حکومت عباسی خلافت کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ہادی نے صرف ایک سال تک حکومت کی اور بائیس (22) سال کی عمر

میں اس دنیائے فانی سے انتقال کر گئے ۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

ہارون رشید

(170ھ تا 193ھ مطابق 786ئ تا 809ئ)

ہادی محمد کے انتقال کے بعد ان کے بھائی ہارون رشید تخت نشین ہوئے۔ عباسی خلفا میں سب سے زیادہ شہرت ان ہی کو ملی ان کا 23 سالہ دور حکومت عباسی خلافت کا عہد زریں یعنی سنہری دور کہلاتا ہے۔ ان کے زمانے میں ملک میں خوشحالی عام تھی اور علم و فن کا خوب چرچا تھا۔ تمدن اور ثقافت کی ترقی کے لئے ان کا دور حکومت ایک مثالی دور تھا۔ ان کی ذات متضاد صفات کا مجموعہ تھی۔ ایک طرف ان کی زندگی عیش پرستانہ تھی تو دوسری طرف وہ بڑے دین دار، پابند شریعت اور علم دوست تھے۔ نماز کے پابند تھے اور خیرات دے کر غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ انہیں جہاد کا شوق اور شہادت کی تمنا تھی۔ وہ جب حج کو جاتے تھے تو بہت سے ایسے لوگوں کو ساتھ لے جاتے جنہیں حج کرنے کی طاقت نہ ہوتی۔ عالموں اور بزرگوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کی نصیحتوں پر عمل کرتے تھے۔ قاضی ابویوسف خلیفہ کے قاضی القضاۃ (Chief Justice) تھے جو ایک سچے اور باکردار عالم دین تھے۔ سلطنت میں تمام قاضیوں کا تقرر وہی کرتے تھے۔ ''بیت الحکمت'' کے نام سے انہوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں کام کرنے والے عالموں اور مترجموں کو اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ رومیوں کے اچانک حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے انہوں نے سرحدوں پر قلعہ بندیاں کیں اور فوجی چھاونیاں قائم کیں۔ رومی مسلمانوں کو خراج (Tax) دیتے تھے۔ جب انہوں نے ٹیکس دینے سے انکار کیا تو خلیفہ نے ان کے خلاف ایسی کاروائی کی کہ انہوں نے پچھلے سالوں کا خراج بھی ادا کیا اور اپنے ملک کو مسلمانوں کے قبضے سے بچالیا۔

یہاں پر ایک بات قابل ذکر ہے کہ مسلمان حکمران جب جہاد کرکے کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو اس پر اپنی حکومت بھی قائم کرتے تھے۔ لیکن ان کو مال و دولت حاصل کرنے کی خواہش نے گھیر لیا تو اب وہ ملک کو فتح کرکے اس پر حکومت کرنے کے بجائے خراج یعنی ٹیکس لینے پر راضی ہوجاتے تھے۔ جس کی وجہ سے اکثر ممالک نے مسلمانوں سے مغلوب ہوکر ٹیکس ادا کرکے اپنے ملک کی آزادی برقرار رکھی اور بعد میں جب انہوں نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا تو مسلمان ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو مال و دولت کی اس بے حد خواہش نے مفتوح اور محکوم ممالک چھوڑنے پر مجبور کیا جیساکہ مسلمانوں کو اسپین (Spain) میں کئی صدیوں تک حکومت کرنے کے بعد وہاں سے نکالا گیا۔ یہ اس لئے ہوا کہ مسلمان حکمران مقبوضہ ملک کے مال و دلت پر قابض ہوکر عیاشی کی زندگی گزارتے تھے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کی پرواہ نہیں کرتے تھے جس کے نتیجے میں انہیں صدیوں کی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا کہ انہیں اسپین (Spain) سے مار مار کر نکالا گیا۔

ہارون رشید کا قاعدہ تھا کہ وہ بھیس بدل کر راتوں کو بغداد کی سڑکوں اور گلیوں میں پھرا کرتے تھے تاکہ لوگوں کے حالات معلوم کریں۔ برامکہ نامی ایرانی نسل کے ایک آدمی ان کے معتمد وزیر تھے وہ بہت سخی تھے اور ان کی سخاوت کی شہرت ساری اسلامی دنیا میں پھیل گئی تھی۔ وہ کبھی کسی سائل کا سوال رد نہیں کرتے تھے عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی امداد کرتے تھے اور غریبوں میں اپنی دولت تقسیم کرتے تھے۔ ہارون رشید کی سلطنت کو ان کی بدولت چار چاند لگ گئے تھے۔ لیکن خلیفہ اور وزیر برامکہ کی یہ دوستی ہمیشہ قائم نہ رہ سکی اور خلیفہ نے برامکہ سے ناراض ہوکر ان کا قتل کروایا لیکن بعد میں ان کے قتل ہونے پر روتے تھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ ان کی قتل خلیفہ کے لئے مجبوری بن گئی تھی۔ کیونکہ ان کو خدشہ ہوا تھا کہ لوگوں میں مقبولیت کی وجہ سے کہیں وہ تخت خلافت پر قابض نہ ہوجائیں۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ حکومت سازی میں لحاظ نہ باپ کا نہ بیٹے کا بھائیوں کی بات ہی نہیں۔ تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ باپ نے بیٹے کو اپنی حکومت بچانے کے لئے قتل کروایا اور بیٹے نے حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے باپ کا قتل کروایا۔

ابراہیم اغلب

خلیفہ منصور کے بعد مراکش کا علاقہ عباسی خلافت کے اقتدار سے نکل گیا تھا اور ہارون رشید کے زمانے میں افریقہ موجودہ طرابلس، تیونس اور الجزائر کے علاقوں پر مشتمل خود مختار ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقے مرکزِ خلافت سے دور تھے۔ اس لئے ان کا انتظام مشکل سے ہو رہا تھا۔ ہارون رشید نے یہاں کی حکومت ابراہیم بن اغلب کے سپرد کردی۔ اس طرح افریقہ میں ایک نئی حکومت کی بنیاد پڑگئی جو خاندان اغلب کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اغلبی خاندان کی یہ حکومت 800ئ سے 909ئ تک عملاً خودمختار تھی لیکن عباسی حکومت کے زیر سایہ کام کرتی تھی۔ اس کا دارالخلافہ قیروان تھا جو علوم و فنون کا مرکز تھا۔ انہوں نے جزیرہ صقیلہ کو فتح کیا جس سے ان کا سمندری سفر آسان ہوگیا۔ اس دور میں جنوبی اٹلی پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہوگیا تھا۔

تاریخ اسلام میں ہارون رشید کی یہ ایک بڑی غلطی تھی کہ انہوں نے اپنی مضبوط سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کرکے کمزور کردیا۔ ایک بیٹے امین کو مغربی ایران اور عراق سے افریقہ تک کے سارے علاقے دے دیئے اور دوسرے بیٹے مامون رشید کو ایران کا بڑا حصّہ اور دریائے سندھ تک کے تمام مشرقی علاقے مل گئے۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ بیٹوں میں لڑائی شروع ہوگئی اور بڑی خونریزی ہوئی ملک کے دونوں حصّوں میں بدامنی پھیل گئی۔ آخر کار مامون کامیاب ہوئے اور عباسی سلطنت ایک بار پھر متحد ہوگئی۔ ہارون رشید نے 23 سال شان و شوکت سے حکومت کی اور 74 سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے انتقال کرگئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

مامون رشید

ھ تا 218ھ مطابق 813ئ تا 833ئ

ہارون رشید کے دو بیٹوں مامون رشید اور امین کے تخت نشینی کی لڑائی میں امین کے مارے جانے کے بعد مامون رشید تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر شاندار طریقے سے حکومت کی۔ اپنے بھائی امین کے قتل ہونے کے بعد انہوں نے 6سال تک مروہیَ میں سکونت اختیار لی۔ اس دوران عراق میں ہنگامے ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ شیعہ مسلک کے قائل ہوگئے تھے۔ اس لئے عباسیوں میں بے چینی پھیل گئی اور انہوں نے عراق میں بغاوت کردی۔ خلیفہ کو بالآخر اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا جس کے نتیجے میں ہنگامے ختم ہوگئے۔ ان کے دور حکومت میں مسلمانوں کو ایک اہم کامیابی ملی کہ انہوں نے جزیرہ صقیلہ اور جزیرہ کریٹ کو فتح کیا۔ صقیلہ کو قیروان کے حکمرانوں نے جو عباسی خلافت کے باجگزار تھے فتح کیا اور کریٹ کو عندلس سے نکلی ہوئی مسلمانوں کی ایک جماعت نے فتح کیا۔ ان کے دور حکومت میں ترکوں اور کابل کے حکمرانوں نے اسلام قبول کیا۔ مامون ایک نرم مزاج بادشاہ تھے۔ وہ علم وادب کے شوقین تھے۔ اس لئے عالموں اور ادیبوں کی عزت کرتے تھے۔ وہ بڑے عادل اور انصاف پسند حکمران تھے۔ خود لوگوں کی شکایتیں سنتے تھے۔ ان کی عدالت میں ایک معمولی آدمی شہزادے سے اپنا حق لے سکتا تھا جیسا کہ ان کے دربار میں ایک بوڑھی عورت نے بادشاہ کے بیٹے کے خلاف شکایت کی کہ انہوں نے میری جائیداد پر قبضہ کرلیا۔ جب مقدمہ پیش ہوا تو بادشاہ نے اپنے لڑکے عباس کو بڑھیا کے پاس کھڑا کرکے دونوں کے بیانات سن لیئے۔ بیانات سننے کے بعد بادشاہ نے بڑھیا کے حق میں فیصلہ دیا اور اس کی جائیداد واپس کردی۔ بڑھیا اپنی جائیداد لے کر خوش ہوگئی اور شہزادے نے بڑھیا کو اطمینان سے جائیداد واپس کردی۔ ان کی انصاف پسندی کا ایک اور واقعہ مشہور ہے۔ ایک شخص نے ان پر بیس ہزار (20000) سکوں کا دعویٰ کیا۔ بادشاہ کو قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ نوکروں نے عدالت میں بادشاہ کے لئے قالین بچھائے۔ قاضی یعنی جج صاحب نے جب دیکھا کہ بادشاہ کے لئے قالین بچھائے گئے تو انہوں نے قالین ہٹانے کے لئے کہا کہ عدالت میں دعویٰ کرنے والا اور ملزم دونوں برابر ہیں اور کسی کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بادشاہ نے قاضی صاحب کی یہ حق پرستی دیکھ کر ان کی تنخواہ بڑھاکر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ جس حکومت میں ایسے ہمت والے قاضی ہوں اور ایسے انصاف پسند بادشاہ ہوں تو عام لوگ کس طرح امن و امان اور خیر و عافیت کی زندگی گزارتے ہوں گے اور کیا آج کل کی دنیا میں مساوات کی ایسی کوئی مثال مل سکتی ہے۔ بادشاہ اپنی سلطنت کی ہر چیز اور ہر کام سے واقف

رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے سارے ملک میں مخبر اور جاسوس تائینات کئے تھے جو بادشاہ کو ملک کے حالات کی خبر دیتے تھے۔ حکومت کو ملک کے حالات کی اطلاع دینے کے اس طریقے کو آجکل کے زمانے میں معلوماتی محکمہ (Intellience Bureau) کہتے ہیں۔

مامون کے مزاج میں حد سے زیادہ سادگی اور انکساری تھی وہ اپنے ساتھیوں اور درباریوں میں نہایت سادگی اور بے تکلفی سے بیٹھتے تھے۔ وہ بڑے عالم اور حافظ قرآن تھے۔ دینی علوم کی انہیں کافی واقفیت تھی۔ انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ مختلف زبانوں میں کروایا۔ روم میں عقلی علوم کی کتابوں پر پابندی لگادی گئی تھی۔ یہ کتابیں افلاطون، سقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس کی تصانیف تھیں۔ ان کو بغداد منگوا کر ایک بڑی لائبریری میں منتقل کیا جن کو پڑھ کر لوگ دنیاوی علوم حاصل کرتے تھے۔ لیکن بادشاہ کو ان فلسفیوں اور فلاسفروں کا اتنا اثر ہوا کہ وہ اس عقیدے کے قائل ہوگئے کہ قرآن مخلوق ہے یعنی قرآن دراصل اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ رسول اللہؐ کا کلام ہے۔ جسے خدا نے منظوری دی۔ اس نظریہ کی صداقت پر بادشاہ کو اس حد تک یقین ہوگیا کہ انہوں نے علمائ کو مجبور کیا کہ وہ اس نظریہ کو قبول کریں ورنہ سزا کے لئے تیار ہوجائیں۔ اس طرح سے اس صاحب قرآن حکمران نے خلق قرآن کو حقیقت سمجھ کر مسلمانوں میں فتنہ اٹھایا اور علمائ کو مجبور کیا کہ وہ اس نظریہ کو تسلیم کریں۔ اب تک اگرچہ آزادی رائے پر پابندی تھی تو وہ صرف سیاسی معاملات تک محدود تھی لیکن اب اس صاحب قرآن نے خلق قرآن کے عقیدے کو اپنا کر لوگوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور کردیا اور مسلمانوں میں انتشار پھیلایا اور مذہب کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے کی بے سود کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں کے ہاتھوں علمائے وقت خاص طور امام احمد بن حنبل پر بہت سختیاں کی گئیں کیونکہ انہوں نے اس مسئلے کو قرآن و سنت کے خلاف قرار دیا۔ وہ اڑتالیس سال کی عمر میں 20 سال حکومت کرکے دنیا سے چل بسے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

معتصم باللہ

(218ھ تا 227ھ مطابق 833ئ تا 842ئ)

مامون رشید کے بعد ان کے بھائی معتصم باللہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے زمانے میں فوجی طاقت میں اضافہ ہوا۔ ان کا مشہور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے روم پر حملہ کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ انہیں جب معلوم ہوا کہ رومیوں نے ملک کی سرحد پر حملہ کرکے بہت سے مسلمانوں کو قید کیا جن میں ایک بوڑھی عورت بھی ہے جو بادشاہ کو مدد کے لئے پکار رہی ہے۔ یہ سن کر انہوں نے فوراً رومیوں پر لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ حالانکہ ایک نجومی نے بتایا کہ حملے کا یہ وقت منحوس گھڑی ہے۔ اس لئے فوج کشی مناسب نہیں لیکن بادشاہ نے نجومی کے مشورے کو رد کرکے فوج کشی کا حکم دے دیا۔ ان کے لشکر نے ایشائے کوچک کو للکارا اور اس وقت تک واپس نہ لوٹا جب تک اس بڑھیا کو رہا نہ کرالیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا لشکر واپس لوٹنے کے بجائے آگے بڑھتا تو روم کی پوروی سلطنت مسلمانوں کے قبضے میں آجاتی۔ لیکن خدا کا یہی منشا تھا کہ مسلمان سلطنت کے دروازے پر دستک دے کر واپس لوٹ آئے اور بڑھیا کی رہائی پر ہی قناعت کی۔ مسلمانوں کی واپسی کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب مسلمان قسطنطنیہ کے قریب پہنچ گئے تھے تو بادشاہ کو اپنے بھتیجے عباس کی بغاوت کی اطلاع ملی جس کی وجہ سے اس مہم کو نامکمل چھوڑ کر انہیں بغداد واپس آنا پڑا۔ ان کے واپس آنے پر ایک مشہور شاعر ابو تمامؔ نے ان کی شان میں ایک قصیدہ پڑا کہ تقدیر کے فیصلے ستارے نہیں تلوار کرتی ہے۔

معتصم باللہ کے عہد حکومت میں ایک اور واقعہ پیش آیا کہ بابکؔ خرمی ایک غیر مسلم ایرانی نے ایک ایسی تحریک شروع کردی جس کا مقصد مسلمانوں کو گمراہ کرنا تھا۔ اس اسلام دشمن تحریک میں بہت سارے مسلمان شامل ہوگئے تھے جنہوں نے آزربائیجان کے پہاڑی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ بادشاہ نے اس اسلام دشمن کو گرفتار کرکے قتل کروایا۔ اس کے بعد انہوں نے بغداد کے شمال میں تقریباً پچھتھر (75) میل دور سامرآ کے نام سے ایک شہر بسایا اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا بعد میں اسے چھوڑ کر انہونے بغداد کو پھر سے اپنا دارالخلافہ بنایا اور تاحیات اسی میں رہے۔

واثق باللہ

(227ھ تا 232ھ مطابق 842ئ تا 847ئ)

معتصم باللہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے واشق باللہ نے اسلامی حکومت کا تخت سنبھالا۔ ان کے دور حکومت میں مسلمانوں کی کوئی خاص پیش رفت دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اس لئے تاریخ اسلام میں ان لی حکومت کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ملتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک خاموش حکمران تھے۔

متوکل معتصم

(232ھ تا 247ئ مطابق 846ئ تا 861ئ)

واثق معتصم کے بعد ان کے بھائی متوکل معتصم تخت خلافت پر بیٹھ گئے۔ ان کا دور خلافت عباسی خلافت کے عروج کا آخری دور ہے۔ ان کے عہد حکومت میں خوشحالی عام تھی کیونکہ بازاروں میں مہنگائی نہیں تھی۔ چیزیں بہت سستی ملتی تھیں۔ وہ نرم طبعیت کے بادشاہ تھے اور کہتے تھے کہ اکثر خلفائ نے رعایا پر اس لئے سختی کی کہ وہ ان کے فرمانبردار رہیں لیکن میں نرمی کرتا ہوں تاکہ لوگ مجھ سے محبت کریں۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خلقِ قرآن کے نظریہ پر پابندی لگادی اور اس پر مناظرے اور مباحثے بند کرادئے۔

چونکہ وہ ایک خاندانی حکومت کے بادشاہ تھے کسی جمہوری حکومت کے سربراہ نہیں تھے۔ اس لئے ان میں بادشاہوں کی خود سری اور اپنی بات منوانے کی خواہش کا جذبہ موجود تھا۔ انہوں نے اس کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ حضرت علی کی اولاد کی طرف ہمیشہ خطرہ محسوس کرتے تھے۔ اسی طرح رومیوں سے مسلسل سرحدی لڑائیوں کی وجہ سے وہ ملک کی عیسائی آبادی کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آل علی٦ کے متعلق انہوں نے اپنے مخالفانہ جذبات کا اظہار اس طرح کیا کہ کربلا میں حضرت امام حسین کا مزار ڈھادیا اور عیسائیوں کے بعض معاملات پر پابندی لگادی۔ ان میں ایک پابندی یہ تھی کہ وہ ایک مخصوص لباس پہنا کریں تاکہ ان کو عیسائی مذہب میں شمار کیا جاسکے۔

عباسی حکومت کا زوال

متوکل معتصم عباسی خلافت کے آخری طاقتور حکمران تھے۔ ان کے بعد عباسی خلافت کا زوال شروع ہوگیا۔ ان کا زوال اس وجہ سے نہیں ہوا کہ ان کے حکمران نا اہل تھے بلکہ ان کے زوال کی وجہ ترکوں کا اقتدار تھا جو معتصم باللہ کے زمانے میں بڑھنا شروع ہوگیا تھا جن کی خلافت مضبوط کرنے میں ایرانیوں نے مدد کی کیونکہ حکومت میں وزیر اور اعلیٰ عہدے دار ایرانی ہوتے تھے۔ خلافت کی مضبوطی کے لئے یہ ٹھیک تھا کہ عربی اور ایرانی ایک دوسرے سے لڑنے کے بجائے خلافت کے استحکام کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اس تعاون کو اسلامی برادری کی بنیاد پر فروغ دیا جاسکتا تھا۔ لیکن خلافت سے اسلامی روح اور نظریہ کو اسی وقت رخصت کیا جاچکا تھا جب خلافت کی جگہ ملوکیت قائم ہوچکی تھی۔ عباسیوں نے ابتدائی دور میں اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کو آگے بڑھایا۔ عباسی دور خلافت میں ترکوں نے بڑی تیزی سے اسلام قبول کرنا شروع کردیا تھا۔ معتصم باللہ نے اپنے ذاتی مفاد اور محافظت کے لئے ہزاروں کی تعداد میں ترکوں کو فوج میں بھرتی کیا۔ یہ لوگ چونکہ فطری طور پر جنگجو اور دلیر تھے۔ اس لئے وہ جلد ہی فوجی نظام پر چھا گئے اور ان کا زور اتنا بڑھ گیا کہ وہ امورِ سلطنت میں مداخلت کرنے لگے اور آخر کار خلیفہ کو قتل کردیا۔ یہ لوگ چونکہ نئے نئے مسلمان ہورہے تھے اور ان کی ایک بڑی تعداد ابھی غیر مسلم اور ناتربیت یافتہ تھی۔ اس لئے اکثر نامناسب کام کرتے تھے۔ ان کی اس نااہلیت کی وجہ سے معتصم بغداد چھوڑ کر سامرآ چلا گیا۔ ان میں جو مسلمان تھے ان کی بھی صحیح معنوں میں اسلامی تربیت نہیں ہوئی تھی اور وہ ایرانیوں کی طرح پختہ مسلمان نہیں تھے۔ اس لئے یہ لوگ ہر بات پر مسلمانوں کے بجائے ترکوں کے مفاد میں سوچتے تھے اور اسلامی نصب العین کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے نسلی اور وطنی بنیاد پر ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ یہ لوگ اب بڑے بہادر بن گئے کہ اب وہ خلیفہ کا حکم سننے سے بھی انکار کرتے تھے۔ انہوں نے کئی خلفائ کو تخت سے اتار دیا اور بعض کو قتل کردیا۔ متوکل کی وفات کے بعد انہوں نے آٹھ سال کی مختصر مدت میں چار خلفائ کو تخت نشین کرکے یکے بعد دیگرے تخت سے اتار دیا۔ اس طرح ترکوں نے مرکزی حکومت کو کمزور تو کردیا لیکن خود بھی کوئی مضبوط حکومت نہ بنا سکے اور سلطنت کی یہ حالت دیکھ کر مختلف صوبوں کے امیروں اور صوبے داروں نے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم کرلیں یہ حکومتیں عباسی خلیفہ کو تسلیم کرتی تھیں اور ان کی مسجدوں میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ بھی پڑھتے تھے۔ لیکن عباسی خلیفہ کا کوئی حکم نہیں چلتا تھا۔ زوال کے اس دور میں جو اہم

واقعات پیش آئے ان میں دو قابل ذکر ہیں۔ ایک واقعہ حبشیوں کی بغاوت اور دوسرا قرامطہ کا فتنہ ہے۔ ایک ایرانی نے حبشی غلاموں کی مدد سے عراق میں ہنگامہ کیا چونکہ حبشیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے ایرانیوں کا ساتھ دیا اور جنوبی عراق پر قبضہ کرلیا اور مسلمانوں پر بڑے مظالم کئے۔ اس بغاوت میں لاکھوں بے گناہ شہری مارے گئے۔ یہ بغاوت 255ھ سے 270ھ تک یعنی پندرہ سال جاری رہی۔

دوسری بغاوت قرمطہ کا فتنہ ہے۔ بصرہ میں قرمط نامی ایک شخص نے بدامنی سے فائدہ اٹھا کر ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ جس کی پیروی کرنے والے قرامطی کہلاتے ہیں۔ اس فتنے کا آغاز 278ھ میں ہوا اور پچاس سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ جنوبی عراق اور شام ان کے ظلم و ستم اور لوٹ مار کے سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ یہ لوگ اتنے ظالم تھے کہ انہوں نے 317ھ میں مکہ میں حج کے موقعہ پر حاجیوں کا قتل عام کیا یہاں تک کہ حجرِ اسود کو اٹھا کر لے گئے۔ جو بعد میں فاطمی حکمران عبیداللہ کے دور حکومت میں مکہ واپس لایا گیا۔ عباسی حکومت اب زوال پذیر ہو رہی تھی اور ان کی حکومت بد نظمی کی وجہ سے انارکی (Anarchy) بد نظمی کی حکومت بن چکی تھی۔ یعنی حکومت ایسی حالت میں تھی کہ قاعدے اور قانون کی تعمیل نہیں کی جاتی تھی۔ معاشرے میں انتشار تھا۔ اس دورِ زوال میں عباسی حکمرانوں میں بعض اچھے اور قابل لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے زوال کو روکنے کی کوشش کی ان میں مہتدیؒ کا نام قابل ذکر ہے۔

مہتدی باللہ

(247ھ تا 249ھ مطابق 862ئ تا 864ئ)

مہتدی نے عباسی خلافت کو دوبارہ اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی وہ چاہتے تھے کہ عمر بن عبدالعزیز کی طرح بنوں۔ عباسیوں میں ایک شاندار اور پرامن حکومت قائم کروں۔ لیکن اجڑ اور جاہل ترکوں نے اسلامی پابندیوں سے گھبرا کر انہیں قتل کر دیا اور صرف ایک سال میں ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

آئے تھے وہ مثل بلبل سیر گلشن کر گئے

لے لو مالی باغ اپنا ہم تو اپنے گھر چلے

خلیفہ معتمد علی اللہ

(249ھ تا 278ھ مطابق 863ئ تا 892ئ)

مہتدی باللہ کے بعد معتمد علی اللہ نے خلافت کا چارج سنبھالا لیکن وہ عباسی خاندان کے اجڑے ہوئے گھر کو دوبارہ تعمیر نہ کرسکے۔ اس کے عہد حکومت میں بھی ترکوں نے بغاوتیں کیں جس کی وجہ سے وہ کوئی تعمیری کام نہ کرسکے۔

خلیفہ موفق باللہ

(892ئ تا 895ئ)

خلیفہ معتمد کے بعد ان کے بھائی موفق باللہ کو حکومت سنبھالنے کا موقعہ ملا۔ لیکن انہوں نے بھی ترکوں کی مداخلت کی وجہ سے کسی خاص کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اگرچہ خلیفہ نہیں تھے لیکن حکومت کا اقتدار ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ یعنی وہ قائمِ مقام حکمران تھے۔ وہ ایک اچھے سپاہ سالار تھے۔ انہوں نے خلافت قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ حبشیوں کی بغاوت کو انہوں نے ختم کیا اور ترکوں کو حد سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ انہوں نے تین سال سے کم وقت کی حکومت کرکے دنیا سے انتقال کیا۔

خلیفہ معتضد باللہ

(279 تا 289ھ مطابق 895تا 905ئ)

معتضد باللہ خلیفہ موفق باللہ کے صاحبزادے تھے۔ عباسی دور کے زوال میں انہوں نے سب سے زیادہ خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ایک وسیع علاقے عرب سے لے کر ایران اور آرمینیہ تک حکومت کرکے دوبارہ امن امان قائم کیا اور عباسی حکومت کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دے کر دوبارہ اس کی شان بحال کردی۔ ان کے عہد میں مصر و شام کی حکومتوں نے بھی عباسی خلافت کی اطاعت قبول کرلی۔ اپنے کارناموں کی وجہ سے وہ سفاح ثانی یعنی عباسی حکومت کے دوسرے بانی کہلاتے تھے۔ جنہوں نے عباسی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی اور اس حکومت کے پہلے خلیفہ تھے۔ انہوں نے امن و امان قائم کرنے کے سلسلے میں مخالفوں پر کافی سختیاں کیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کرنے کی کوشش بھی کی۔ وہ ذاتی طور پر ایک دیندار انسان تھے۔ انہوں نے نجومیوں اور جادوگروں کو سڑکوں پر بیٹھنے سے منع کیا اور فلسفہ کے ان کتابوں پر جو مسلمانوں کو گمراہ کرتی تھیں پابندی لگادی۔ ایرانی آتش پرستوں کے زیر اثر مسلمان جو نو روز کے موقع پر آگ جلاتے تھے لی اس رسم پر پابندی لگادی۔ ان کے دور حکومت میں عدالتیں آزاد تھیں اور خلیفہ سمیت امرائ بھی عدالت کی بازپرسی سے بچ نہیں سکتے تھے۔ ان کے زمانے میں ٹیکسوں میں کمی کردی گئی۔ جس سے لوگوں کو راحت مل گئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے تین بیٹے یکے بعد دیگرے ایک کے بعد دوسرا تخت نشین ہوئے۔

مکتفی باللہ

(289ھ تا 295ھ مطابق 902ئ تا 908ئ)

مکتفی باللہ معتضد باللہ کے بڑے بیٹے تھے وہ ایک اچھے حکمران تھے کچھ عرصہ تک انہوں نے اچھی حکومت کی لیکن اس کے بعد صورت حال بگڑ گئی اور حکومت میں پھر سے انتشار پیدا ہوگیا اور خلیفہ کے انتقال تک خلافت کے حالات میں تبدیلیاں آتی رہیں۔ لیکن کسی بڑی بغاوت نے سر نہیں اٹھایا۔
295ہجری مطابق 908عیسوی ان کا انتقال ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

مقتدر باللہ

(295ھ تا 320ھ مطابق 908ئ تا 932ئ)

ملتفی باللہ کے بعد مقتدر باللہ تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے پچیس (25) سال حکومت کی لیکن ان کی حکومت کا سارا زمانہ ہنگاموں اور شورشوں کی نظر ہوگیا۔ یہ حکمران عیش پرست تھے۔ ان کا شاہی دربار ناچنے اور گانے والیوں کا مرکز بن گیا۔ انہوں نے دربار کے اخراجات حد سے زیادہ بڑھائے۔ ان کے فضول کاموں سے سرکاری خزانہ خالی ہوگیا اور ملازموں کی کئی کئی مہینوں کی تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امرائ نے بغاوت کی اور بادشاہ کو معذول کر کے قتل کروایا اور ان کے بھائی قاہر باللہ کو تخت شاہی پر بٹھایا۔

قاہر باللہ

(320ھ تا 322ھ مطابق 932ئ تا 933ئ)

قاہر باللہ کے دور حکومت میں گزشتہ حکمرانوں کی عیاشی کے خلاف سخت رد عمل ظاہر ہوا۔ ناچنے اور گانے والی عورتوں کا پیشہ اور شراب نوشی قانوناً بند کردی گئی۔ گانے والوں کو قید کی سزا سنائی گئی۔ لیکن یہ ایک جذباتی ردعمل تھا جس کے پیچھے نہ کوئی فکر کام کررہی تھی اور نہ کوئی منظم جماعت تھی۔ خلیفہ قاہر باللہ مذکورہ اقدامات کے باوجود نہ شراب چھوڑ سکے اور نہ حسین لونڈیوں کی صحبت ترک کرسکے۔ دو سال حکومت کرنے کے بعد انہوں نے وفات پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰاجِعُوۡنَ۔

راضی باللہ

(322ھ تا 328ھ مطابق 934ئ تا 940ئ)

قاہر باللہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے راضی باللہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے دور حکومت میں مسلمانوں کی گرتی ہوئی اخلاقی حالات کے خلاف لوگوں کا رد عمل ہوا۔ امام احمد بن حنبل کے پیرؤں، حنبلیوں نے عوامی سطح پر احتساب شروع کیا۔ وہ فوجی افسروں اور عام لوگوں کے گھروں پر چھاپے مارتے تھے اور جہاں کہیں قابل اعتراض غیر شرعی چیزیں نظر آتیں ان کو لے جاتے تھے۔ گانے والی عورتوں کو مارتے، موسیقی کے آلات توڑ ڈالتے اور غیر محرم عورتوں کے ساتھ چلنے کو روکتے تھے۔ لیکن یہ تحریک بھی غیر منظم اور جذباتی نوعیت کی تھی۔ اس کے پیچھے نہ کوئی ٹھوس فکر تھی او رنہ کوئی منظم جماعت اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ حنبلیوں کی یہ اصلاحی تحریک حنبلیوں اور شافعیوں یعنی امام حنبل اور امام شافعی کے پیروؤں (Followers) کے درمیان اختلاف میں تبدیل ہو کر ختم ہوگئی۔

متقی باللہ

(329ھ تا 333ھ مطابق 940ئ تا 944ئ)

راضی باللہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے متقی باللہ تخت نشین ہوئے۔ نام سے وہ نیک اور زاہد تھے لیکن اس کے علاوہ ان میں اور کوئی خوبی نہ تھی۔ حکومت کرنے میں ان کا کوئی خاص طریقہ سامنے نہیں آتا ہے۔ ان کے دور حکومت میں اسلامی حکومت کا نظام درہم برہم ہوچکا تھا۔ مغربی اور جنوبی ایران میں قائم ہوئی حکومت بنی بویہ کے ایک حکمران معزالدولہ نے 334ھ میں بغداد پر قبضہ کرلیا۔ یہ خلافت اس لئے قائم رہی کہ مسلمان خلافت کو اسلامی سیاسی نظام کا لازمی حصہ سمجھتے تھے اور ایک خلیفہ کے بعد دوسرا خلیفہ تخت نشین ہوتا رہا۔ لیکن خلیفہ کو مکمل اختیار حاصل نہیں ہوتا تھا۔ حکومت میں دوسرے لوگوں کی مداخلت ہوتی تھی۔ اس طرح مسلمانوں کی یہ حالت دو سو (200) سال تک رہی۔ اس کے بعد عباسی خلفائ پھر آزاد ہوگئے۔ لیکن ان کی حکومت عراق تک ہی محدود رہی اور وہ کوئی بڑی سلطنت قائم نہ کرسکے۔ اس کے بعد عباسی خلفائ کی یہ آزاد حکومت سو (100)سال کے عرصے تک قائم رہنے کے بعد تاتاریوں کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔ اس طرح عباسی خلافت کے عروج کا زمانہ 132ھ سے 247ھ تک ہے۔ اس کے بعد زوال شروع ہوگیا اور 334ھ میں بنی بویہ کے ہاتھوں عباسی خلفائ کی خود مختاری ختم ہوگئی اور خلافت کا خاتمہ کے بعد عرب میں موروثی حکومت کا آغاز ہوگیا اور یہ سلسلہ آج تک موجود ہے۔ اگرچہ چند ملکوں میں جمہوری طرز کی حکومت بھی ہے۔ مسلمانوں کی حکومت چاہئے خلافت ہو یا ملوکیت، جمہویت (Democracy) ہو یا آمریت (Dictatorship) ہو ہر حال میں قرآن و سنت کی پابند ہونی چاہے ے۔ یعنی مسلمانوں کی حکومت انسانی قانون کے بجائے خدائی قانون کی پابند ہو۔ کیونکہ خدا کا قانون مکمل (Perfect) ہے اور انسانوں کا بنایا ہوا قانون نامکمل (Imperfect) ہے۔ جب تک مسلمانوں نے قرآن وسنت کے مطابق حکومت کی تب تک وہ دنیا پر حاوی رہے اور جب انہوں نے خدائی قانون سے دست بردار ہوکر انسانی قانون کو اپنایا تو ان کی کوئی وقعت نہ رہی اور دنیا کے وہ لوگ جو مسلمانوں سے ڈرتے تھے ان کے سروں پر سوار ہوگئے اور انہیں جہاں چاہتے ہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کرلے جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک مسلمان جہاد کو ترجیح دیتے رہے تب تک وہ دنیا پر حاوی رہے اور جب انہوں نے جہاد کو ترک کیا تو انہیں اپنی گردن میں غلامی کا طوق ڈالنا پڑا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جب فرقوں میں بٹ گئے تو ان کی اسلامی شان و شوکت بھی دنیائی خواہشات کے نیچے دب گئی۔ ان کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ مسلمانوں کو سیاست اور حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسی لئے وہ سیاست اور حکومت سے دور رہتے ہیں۔ دوسری جماعت کے لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ مسجدوں میں بیٹھ کر چلہ بندی کرکے دین کی میٹھی میٹھی باتیں بتا کر دین کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ اس طرح دین دنیا پر غالب آجائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کی اشاعت کے لئے جہاد اور اسلامی سیاست اور حکومت لازمی ہے۔ جب مسلمانوں نے دین پھیلانے کے لئے جہاد کیا تو انہوں نے دنیا کے بیشتر ممالک میں دین اسلام پھیلایا اور جب جہاد یعنی اسلامی جدوجہد کو انہوں نے روکا تو انہیں کئی فتح کئے ہوئے ممالک سے نکالا گیا۔ جیسا کہ اسپین (Spain) سے مسلمانوں کو صدیوں کی حکومت کرنے کے بعد نکالا گیا۔ اس لئے مسلمانوں کو اس بات پر ایمان ہونا چاہیے کہ دین کے لے ے جدوجہد کرنا ان کے مکمل اور صحیح ایمان کی نشانی ہے۔ جب اور جہاں مسلمانوں نے دین کی جدوجہد سے مَنہ موڑا تو ان کی حیثیت پانی کے جھاگ کے سوا کچھ نہ رہی۔

واضح رہے کہ مسلمان ان پیشن گوئیوں کی غلط فہمی میں نہ رہیں کہ خراسان سے ایک فوج آئے گی جو ساری باطل دنیا کو ہلادے گی اور اسلام دوبارہ زندہ ہو کر دنیا پر چھا جائے گا۔ بلکہ انہیں چاہئے کہ خدا اور اس کے رسولؐ پر مکمل ایمان رکھ کر اسلام کی اشاعت کے لئے زور و شور اور مضبوطی سے کام کریں اور اس کام کے لئے اپنی مالی اور جانی قربانی کے لئے ہمیشہ تیار رہیں۔ کسی آسمانی فوج کا انتظار نہ کریں۔ آسمانی فوج یعنی فرشتوں کی مدد تب آتی ہے جب مسلمان بدر کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ یعنی اسلام کے لئے جنگ بدر کے مسلمانوں کی طرح شہادت دینے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔

برصغیر ہند ۔ موجودہ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں اسلام کا ظہور

عرب اور ہند (موجودہ ہندوستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش) کے تجارتی تعلقات بہت پرانے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے کہ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ مجھے ہندوستان کی طرف اسلام کی خوشبو آتی ہے۔ اگرچہ یہ حدیث ضعیف مانی جاتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں

کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ہندوستان سے بے خبر نہ تھے اور علامہ اقبالؒ نے اس حدیث کی طرف یوں اشارہ کیا تھا:

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکان سے

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اس حدیث رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اور برصغیر ہند کے درمیان قدیم زمانے سے تجارتی تعلقات قائم تھے اور یہ مالی تجارت عرب کی بندرگاہوں سے لے کر ہندوستانی بندرگاہوں تک قائم تھی اور اس تجارت سے دونوں ممالک کے علاوہ پوری دنیا کی تاریخ متاثر رہی ہے۔

جب عرب اسلام کی تعلیمات سے روشن ہوا برصغیر ہند کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات برقرار رہے۔ مسلمان تاجروں نے اپنی تجارت کا کام جاری رکھا اور کاروباری تعلقات کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی رابطے بھی شروع ہو گئے۔

محمد بن قاسمؒ اور فتح سندھ

خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے تک برصغیر ہند پر عربوں کی طرف سے کوئی باضابطہ چڑھائی نہیں ہوئی۔ ان کے دور حکومت میں حجاج بن یوسف عراق کے گورنر تھے جو اپنی بہادری اور انتظامی قابلیت میں مشہور تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی توسیع میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد ولید بن عبدالملک اور حجاج بن یوسف کا بڑا رول رہا۔ سندھ میں راجہ داہرؔ کی حکومت تھی۔ انہوں نے تحائف سے بھرا ہوا جہاز حجاج بن یوسف کی خدمت میں روانہ کیا۔ جہاز میں کئی مسلمان بھی سوار تھے جو اپنے بال بچوں سمیت حج کو جا رہے تھے۔ بادِ مخالف کی وجہ سے ان کا جہاز سندھ موجودہ کراچی کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ یہاں سندھ کے ڈاکوؤں نے ان کا مال و اسباب لوٹ لیا اور مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ جب حجاج بن یوسف کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے راجہ داہر کے پاس ایک سفیر بھیجا تاکہ گرفتار ہوئے مردوں اور عورتوں کو چھڑایا جائے اور تحفے سمیت انہیں خلیفہ کے حوالے کیا جائے۔ لیکن راجہ داہر نے اس حکم کے ماننے سے انکار کیا۔ حجاج نے غصے میں آ کر اپنے سترہ(17) سالہ بھتیجے محمد بن قاسم کو چھ ہزار (6000) لشکر کے ساتھ 711ئ میں سندھ کو فتح کرنے کے لئے بھیجے۔ انہوں نے قلعہ کو قبضے میں لے کر قیدیوں کو رہا کروایا اور راجہ داہر کی فوج نے

بغیر کسی مزاحمت کے ہتھیار ڈال دئے اور اس طرح سندھ پر محمد بن قاسم کا قبضہ ہوگیا۔

محمد بن قاسم ؒ نے ہندوستان پر تقریباً چار سال تک حکومت کی۔ لیکن اس مختصر وقت میں انہوں نے ایک ایسا اسلامی انقلاب برپا کیا جس کی شہرت آج تک دنیا میں موجود ہے۔ انہوں نے اہل سندھ پر ہمدردی اور دردمندی سے حکومت کی ہندو لوگوں کو اپنے حقوق دےئے اور ایسا نظم ونسق قائم کیا جو پہلے ہندو راجاؤں اور حکمرانوں سے بہتر تھا۔

ڈاکٹر تارا چند اپنی کتاب ''مختصر تاریخ اہل ہند'' (A Short history of Indian people) میں محمد بن قاسم کے متعلق لکھتے ہیں کہ مسلمان فاتح محمد بن قاسم نے مفتوح لوگوں (فتح کئے گئے لوگوں) کے ساتھ عقلمندی سے فیاضی کا سلوک کیا۔ کہ مالگزاری کے پرانے ملازموں کو برقرار رکھا۔ ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو اپنے مندروں میں پرستش کرنے کی اجازت دی، لیکن ان پر ایک معمولی ٹیکس (Tax) عائید کیا جو آمدنی کے مطابق ادا کرنا پڑتا تھا۔ زمینداروں کو اپنے حساب سے ٹیکس دینے کی اجازت تھی۔ ڈاکٹر تاراچند کے کہنے کے مطابق لوگوں سے جو معمولی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا وہ مسلمانوں کی زکوٰۃ اور صدقہ سے کم تھا۔ مسلمانوں کو بیت المال یعنی شاہی خزانے میں اپنے مال و دولت کا ڈھائی فی صد بطور زکوٰۃ داخل کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ غیر مسلم جہاد یعنی جنگی خدمات سے آزاد تھے جو اسلامی حکومت میں ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جزیہ وصول کرنے کے لئے برہمن مقرر تھے جو غریبوں سے جزیہ بہت کم لیتے تھے اور غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کو یہ جزیہ (Tax) معاف کرتے تھے۔ انہوں نے پرانے نظامِ حکومت کو وسیع بنیاد پر تبدیل نہ کیا۔ راجہ داہر کو وزارت کے عہدے پر برقرار رکھا اور نظام سلطنت میں ہندوؤں کو شامل رکھا۔ لیکن فوجی نظام مسلمانوں کے ہاتھ میں رکھا اور خود سربراہ مملکت ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی فوج کے سربراہ بھی تھے۔ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قاضی کرتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کے لئے ان کی پنچایتیں بدستور قائم تھیں۔ بحوالہ مختصر تاریخ اہل ہند۔ ڈاکٹر تاراچند۔(A short history of Indian people by Dr. Tara Chand)

ئ میں محمد بن قاسم کے سرپرست حجاج بن یوسف وفات پاگئے اور ان کی وفات کے ایک سال بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک بھی انتقال کرگئے اور ان کی سلطنت میں افراتفری مچ گئی۔ آخر کار ولید بن عبدالملک کے بھائی سلیمان کو خلیفہ بنایا گیا۔ انہیں حجاج بن یوسف سے پرانی دشمنی تھی۔ انہوں نے محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلاکر قتل کرواکے انتقام گیری کی پیاس بجھائی۔

محمد بن قاسم کے بعد سندھ کے حالات

محمد بن قاسم کے بعد سندھ کے حالات پوری طرح بگڑ گئے۔ سندھیوں نے بغاوت شروع کردی اور وقت کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم پر سندھ کے گورنر نے ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ وہ اسلام قبول کریں تاکہ انہیں مسلمانوں کے مساوی حقوق ملیں گے۔ چنانچہ بہت سارے سندھی ہندو قبیلوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں راجہ داہر کے بیٹے جے سنگھ بھی شامل تھے۔ لیکن چند سال بعد 720ئ میں ہشام بن عبدالملک کے دور اقتدار میں سندھیوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور کھلم کھلا بغاوت پر اتر آئے۔ اس بغاوت میں بہت سے ایسے قبیلے تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ ہندومت اختیار کیا۔ لیکن مسلمانوں نے بڑی دور اندیشی سے اس بغاوت کو کچل دیا۔ پھر گورنر سندھ حَکم بن مروان کی قیادت میں سندھ کے طول وعرض پر دوبارہ عربوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ عربوں لی ایک بڑی فتح تھی۔ اس دوران خلیفہ وقت منصور کے نام پر منصورہ شہر آباد کیا گیا اور پھر اس شہر کو سندھ کا نیا دارالخلافہ قرار دیا گیا۔ اس کاروائی میں حَکم کے ساتھ محمد بن قاسم کا بیٹا عمر بن محمد بھی تھا۔

ئ میں جب خلافت امویؔ خاندان کے تسلط سے نکل کر عباسیؔ خاندان کے ہاتھ آگئی تو انہوں نے اپنی سلطنت کا دارالخلافہ دمشق سے بغداد منتقل کیا۔ ان کے دور حکومت میں گجرات کی پہلی مسجد تعمیر ہوئی۔ پھر فتح سندھ کے تقریباً ستر (70) سال بعد عربوں کے آپسی اختلافات کی وجہ سے ان کی حکومت کمزور ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں مقامی لوگوں نے از سر نو بغاوت کا آغاز کردیا اور آگے بڑھ کر ملتان پر قبضہ کرلیا۔ ملتان میں ایک بہت بڑا مندر تھا جسے محمد بن قاسم نے برقرار رہنے دیا تھا۔ لیکن عباسی حکمرانوں نے اس کے بدلے میں ایک نئی جامع مسجد تعمیر کروائی جو آج بھی بڑی شان و شوکت سے موجود ہے۔

دنیائی علوم میں بھی عرب کے لوگ ہندوستانیوں سے مستفید ہوئے۔ عربوں نے ہندوستانیوں سے علم ریاضی (Mathematics) کی علامتیں (Nemurals) سیکھ لیں جو ہند کے نام ہندسہ کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستان سے علم طب بھی سیکھا جس کے مطابق وہ بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔ اس طبی علاج کو ہندوستانی میں طبابت کہتے ہیں۔ عرب میں طب نبوت کا علاج موجود تھا

ہندوستانیوں نے بھی اس پر عمل کر کے فائدہ اٹھایا۔

مذہبی حالات

سندھ میں عربوں کی حکومت کے دوران ہندوستان کے دیگر شہروں میں مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہوگئیں جن میں عالم و فاضل لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ لیکن انہوں نے عوام میں اشاعت اسلام کی کوئی منظم کوشش نہ کی۔ اس لئے علمائ، حافظین قرآن اور محدثین کی ایک بڑی تعداد کے باوجود اسلام قبول کرنے (Conversion to Islam) کی رفتار مدھم پڑھ گئی۔ منصورہ کے قابل ذکر عالموں میں ایک عرب نوجوان کا ذکر ہے کہ انہوں نے سندھی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ کے دارالخلافہ منصورہ اور اس کے باہری علاقوں میں علم وادب کی رونق تھی اور ہر علاقے میں اسلام کی تبلیغ کی جاتی تھی۔

ہندوستان میں غزنوی دور کا آغاز

جیسا کہ اس کا ذکر آچکا ہے کہ جوان سالہ سپہ سالار محمد بن قاسم ؒ سندھ اور ملتان فتح کرنے کے صرف چار سال بعد واپس بلاکر قتل کردئے گئے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں اسلام کے جھنڈے لہرائے جاتے۔ بہرحال حجاج بن یوسف امیوں کی سلطنت میں گورنر کے عہدے پر فائز تھے وہ ہاشمیوں کے سخت تر دشمن مانے جاتے تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہاشمیوں کے ہزاروں لوگوں کو قتل کروایا اور ان کی سختیوں کی وجہ سے بنی ہاشم کے بہت سے لوگ اپنے وطن سے ہجرت کرگئے تھے۔ جب وہ عراق کے گورنر بنے تو ہاشمیوں کی ایک بڑی جماعت ہندوستان آگئی اور اسلام کی تشہیر وعظ و تبلیغ کا کام کیا۔ بہرحال محمد بن قاسم نے صحرائے سندھ میں جو فتوحات کئے تھے عرب جانشین ان کو آگے نہ بڑھا سکے۔ اس لئے یہ فتوحات ملتان تک ہی محدود رہے۔ اس کے بعد فتوحات کی آبیاری ان لوگوں نے کی جو عرب سے نہیں بلکہ افغانستان سے آئے تھے۔

امیر ناصرالدین سبکتگین غزنوی

سندھ اور ملتان 713ئ میں فتح ہوئے تھے۔ اس کے بعد تین سو (300) سال تک ہندو راجپوت شمالی ہندوستان میں بلاخوف و خطرہ حکومت کرتے رہے اور باہر سے کوئی حملہ آور نہیںآیا۔ اس کے بعد 980ئ میں امیر ناصر الدین سبکتگین غزنوی شمال مغربی سرحد سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور بعض کئی مقامات کو فتح کرکے یہاں آنے والوں کے لئے راستہ ہموار کیا۔ اس کے بعد شمالی ہندوستان کے تمام حکمرانوں نے ایک بڑا لشکر جمع کیا لیکن سبکتگین غزنوی ہندوستانی فوجیوں کی جرأت اور ہمت دیکھ چکے تھے۔ اس لئے وہ ان کی فوجی طاقت سے مرعوب نہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس قصاب کی طرح سمجھا جو بھیڑوں کی کثرت سے نہیں گھبراتا اور ایک شاہین کا تصور کیا جو پرندوں کے جھنڈ سے ہراسان اور پریشان نہیں ہوتا۔ انہوں نے سرداروں کو بلاکر اپنی فوج کو جہاد کی ترغیب دی اور جنگ میں شہید ہونے والوں کی جنت کی بشارت کی یاد دہانی کرائی تاکہ جنگ میں شرکت کرنے والے شوق شہادت کی پیاس بجھائیں۔ اس کے بعد فوج کو ترتیب دے کر پانچ پانچ سو کے دستوں میں تقسیم کیا تاکہ جب ایک دستہ لڑتے ہوئے تھک جائے تو دوسرا تازہ دم دستہ مقابلے میں آجائے۔ اس طرح کچھ دیر لڑائی جاری رہنے کے بعد جب دشمن کے صفوں میں افراتفری مچ گئی تو تمام فوجی دستوں نے بہ یک وقت پورے زور وطاقت سے حملہ کیا اور دشمن کے لشکر کثیر کو شکست دے کر بھگادیا۔ جنگ میں دشمن کے بہت سارے سپاہی قتل ہوئے اور ایک بڑی تعداد کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس فتح عظیم کے بعد ہندو راجاؤں کی کمزوری پوری طرح ظاہر ہوگئی۔ ہندوؤں کو ایک کے بعد دوسری شکست کا سامنا کرنا پڑا اور قابلؔ اور پشاور کا سارا علاقہ ان سے چھین لیا گیا۔ اس طرح ہند کے ایک بہت بڑے علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

سلطان محمود غزنوی

ناصر الدین سبکتگین غزنوی کی وفات کے بعد 997ئ میں سلطان محمود غزنوی تخت نشین ہوئے۔ ان کی فتوحات سلطان سکندر اعظم کی یاد دلاتی ہیں۔ انہوں نے ہندو راجہ جے پالؔ سنگھ اور انندپالؔ سنگھ کو شکست دے کر ہندوستان کے بہت سارے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ جن میں متھرا، قنوج اور سومناتھ کے علاقے قابل ذکر ہیں۔ ان کے متعلق مورخ تارآچند لکھتے ہیں کہ فتوحات اور حکومت کی توصیع ان کی خواہشات میں اولین درجے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ پورے ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کی جدوجہد میں انہوں نے اپنی ساری زندگی صرف کردی جس میں وہ بہت حدتک کامیاب ہوئے۔ فتوحات کے علاوہ وہ علم و ادب کے بھی بہت شوقین تھے۔ ان کی سرپرستی میں علم وادب نے بہت ترقی کی جس کی وجہ سے ان کی حکومت کو چارچاند لگ گئے۔ وہ قوت ارادی اور مستقل مزاجی کے عظیم الشان انسان تھے۔ ایازؔ ان کے ایک وفادار غلام تھے۔ ان کے متعلق یہ شعر مشہور ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمودؔ و ایازؔ

نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

انہوں نے 1030ئ میں انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعَونَ۔

سلطان مسعود غزنوی

سلطان محمود غزنوی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مسعود غزنوی خلافت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں نے ہانسیؔ قلعہ کو فتح کرکے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ محمود غزنوی کی طرح وہ بھی اہل علم کے قدردان تھے اور ان کے دربار سے بہت سارے اہل علم وابستہ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کئی اَتار وچڑھاؤ دیکھے۔ لاہور ان کی حکومت کا دارالخلافہ رہا۔ چونکہ یہاں غزنیؔ سے کئی اہل علم تجارت اور ملازمت کے سلسلے میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے فیض و برکت سے یہ شہر اسلامی دعوت و تبلیغ اور علمی

سرگرمیوں کا گہوارا بن گیا۔

غزنوی دور میں علم و ادب کا عروج

غزنوی دور علم وادب کا دور مانا جاتا ہے۔ اس دور میں عالموں اور ادیبوں کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں البیرونیؔ ہندوستان تشریف لے آئے۔ انہوں نے ہندوستانی علوم کا گہرا مطالعہ کرکے ہندوؤں کے متعلق الہند کے نام سے ایک اہم اور مفصل کتاب لکھی جس میں اسی (80) مضامین ہیں اور ہندوستان کے مذہب، فلسفہ، ادب، جغرافیہ، علم جوتش، رسم و رواج اور قوانین کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے علم ریاضی (Mathematics)، جغرافیہ (Geography)، طِبیات (Medical)، کیمیائی (Chemical) اور علم معدنیات (Minerals) کے علاوہ بہت ساری کتابیں تصنیف کیں۔ وہ عربی کے علاوہ فارسی، سنسکرت، عبرانی اور یونانی زبانوں سے بھی واقف تھے۔

سلطان مسعود غزنوی نے البیرونی کی بہت عزت کی۔ جس کے نتیجے میں البیرونی نے ان کی حوصلہ افزائی میں قانون مسعودی کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں سلطان کی حکومت کے عدل و انصاف لی تعریف کی گئی۔ اپنی تصنیف کردہ کتاب ''الہند'' کے بارے میں البیرونیؒ کا کہنا ہے کہ ہم نے یہ کتاب اس طرح لکھی کہ اس میں کسی فریق کی طرف کوئی ایسا قول منسوب نہیں جو ان کا اپنا قول نہ ہو اور نہ ان کا کلام نقل کرنے سے احتراز کیا گیا۔ اگرچہ وہ کلام حق کے مخالف اور اہل حق کو سننا بھی ناگوار ہو۔ انہوں نے ایک باب ہندوؤں کے عجیب و غریب رسوم و عادات کے متعلق لکھا۔ جس میں ہندوؤں کی ان تمام باتوں کو جمع کیا گیا جو ان کی نظر میں عجیب و غریب ہیں۔ چونکہ ایک محقق اور عالم ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ہر ایک چیز کو دیانت داری اور ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی، بے جان چیزوں جیسے پتھروں سے بنی ہوئی مورتیوں کی پوجا کو خلاف عقل قرار دیا اور یہ بھی سمجھایا کہ جو جاندار اپنی جان کو بچا نہیں سکتا اس کی عبادت کرنا دانائی نہیں بے سمجھی ہے۔

غوری خاندان

سلطان معزالدین محمد غوری

غزنوی خاندان کی حکومت کے بعد ہندوستان میں غوری خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔ معزالدین محمد غوری نے 1173ئ میں یہ حکومت قائم کی۔ انہوں نے ملتان اور لاہور پر قبضہ کرکے اس حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد بٹھنڈا کا قلعہ فتح کرکے یہاں اپنی طرف سے حاکم مقرر کرکے غزنوی واپس جارہے تھے تو انہیں اطلاع ملی کہ دہلی کے راجہ ایک بڑی فوج لے کر بٹھنڈا پر قبضہ جمانے کے لئے آرہے ہیں۔یہ خبر سن کر وہ واپس آگئے اور حملہ آور فوج سے مقابلہ کیا لیکن فوج کی کمی کی وجہ سے وہ یہ جنگ ہار گئے یہ پہلی لڑائی تھی جس میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں اس شکست کا بڑا رنج ہوا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اگلے سال پوری تیاری کرکے ایک لاکھ سے زائد لشکر کے ساتھ پھر سے حملہ کیا۔ ہندو فوج کی قیادت پرتھوی راج کررہے تھے۔ ان کے ساتھ ہندوستان کے سارے راجپوت تھے اور ایک بڑی تعداد کی فوج تھی۔ انہوں نے مارو یا مرجاوؑ کی قسم کھائی تھی۔ لیکن

محمود غوری کی شاندار قیادت میں انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔ اس فتح نے مسلمانوں کے لئے شمالی ہند کے دروازے کھول دیئے اور دہلی اور اس کے اردگرد کے علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔

سلطان محمد غوری کے اوصاف قابل تعریف ہیں۔ وہ ہندوستان میں مکمل اسلامی حکومت کے بانی تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کے غیر مسلم باشندوں کے خلاف ان کے دل میں عناد، حقارت اور تعصب کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ انہوں نے ہندو خاندانوں سے محبت و ہمدردی کا سلوک کیا۔ ان اوصاف کی وجہ سے ان کی فوج اور جرنیلوں نے ان کا پر خلوص ساتھ دیا۔ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ جب ان سے اس بارے میں سوال کیا گیا کہ اولاد نرینہ یعنی بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی حکومت کا کیا بنے گا۔ کیونکہ ایک عورت کی حکمرانی شریعت اسلامی کے خلاف ہے تو انہوں نے کہا کہ میرے غلام میرے بیٹوں کی طرح ہیں۔ واقعی طور ان کی وفات کے بعد ان کے غلاموں نے حکومت کا انتظام سنبھال کر خاندان غلامان کی سلطنت کی بنیاد ڈالدی۔

خاندان غلامان

قطب الدین ایبک

سلطان محمد غوری کی وفات کے بعد ان کا غلام قطب الدین ایبک ہندوستان کے بادشاہ بن گئے اور اس طرح ہندوستان میں غلاموں کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے صرف چار سال حکومت کی اور 1210ئ میں وفات پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

سلطان التمش

قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد 1210ئ میں التمشؔ نے ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ وہ خدا ترس، ذہین اور قابل اعتماد بادشاہ تھے۔ ان کے زمانے میں منگولوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن التمش نے ان کا مقابلہ کرکے ہندوستان کو ان کی غلامی سے بچا لیا۔ انہوں نے سلطنت کی بنیادیں مستحکم کیں۔ ان کے انتقال کے بعد دس سال تک ملک میں بدنظمی رہی اور یکے بعد دیگرے کئی حکمرانوں نے حکومت کی ان میں التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ بھی شامل تھی۔

رضیہ سلطانہ

رضیہ سلطانہ کا دور حکومت نسوانی پیشوائی کی مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے پریشان کن رہا کیونکہ عورت ہونے کے ناطے ان کی حکمرانی اور قیادت اسلام کی نظر میں جائز نہ تھی۔ اس لئے انہیں زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لوگوں میں کالی بھیڑ(Black Sheep) کی مثال بن کر رہی کیونکہ اسلام میں عورتوں کی حکومت جائز نہیں۔ لیکن اس کے باوجود رضیہ کا دور حکومت کسی حد تک کامیاب رہا۔ اس لئے کہ انہوں نے ملک کو دشمنوں کے حملوں سے بچایا۔

ناصر الدین محمود

ئ میں ناصر الدین محمود تخت نشین ہوئے۔ وہ ایک درویش مزاج بادشاہ تھے۔ سرکاری خزانہ سے تنخواہ نہ لیتے تھے بلکہ قرآن شریف لکھ کر اپنے اور اپنے عیال کے لئے روزی کماتے تھے۔ اَن کی طرز زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولیائ اور صلحائ کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ اکثر وقت عبادت اور تلاوت قرآن مجید میں گزارتے تھے۔ دربار عام کے وقت شاہی لباس پہنتے تھے اور دربار سے باہر عام اور سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ قرآن مجید نقل کرکے اپنا گزارہ کرتے تھے۔

سلطان غیاث الدین بلبنؒ

اسلامی ہندوستان کے بادشاہوں میں بلبن کی حکومت ایک خاص رنگ و ڈھنگ کی تھی۔ وہ اصل میں ایک ترک شاہزادہ تھے۔ انہیں چنگیز خان کے ایک حملے میں گرفتار کرکے غلام کی حیثیت سے بغداد پہنچایا گیا اور جمال الدین بصری نامی ایک شخص نے انہیں خرید کر تعلیم و تربیت دے کر آزاد کیا۔ اس کے بعد وہ دہلی آگئے اور رفتہ رفتہ امرأ کے زمرے میں داخل ہوگئے اور نائب امیر کی حیثیت سے اسلامی سلطنت میں شامل ہوگئے ۔ اس کے بعد 1266ئ میں انہوں نے خلافت کی سربراہی کا عہدہ سنبھالا۔ وہ ایک مدبر اور باصلاحیت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے پیش رو درویش مزاج اور سادہ دل ناصر الدین محمود کے طریقہ کار سے مختلف تھے۔ ان کی قائیدانہ صلاحیتوں اور حکمت عملی نے انہیں ایک جداگانہ ہستی بنادیا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ نبوت کے بعد لوگوں کی خدمت کا سب سے بہترین ذریعہ حکومت ہے اور حکومت چلانے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے جاہ و حشم اور رعب و دبدبہ کو قائم رکھے تاکہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبا سکے۔ ورنہ رعایا خرابیوں میں بتلا ہوکر بغاوت پر اتر آتی ہے۔ وہ اپنی گھریلو زندگی میں بھی سنجیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ جب کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو قہقہے لگا کر نہ ہنستے۔ اس لئے دربار میں موجود کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ ہنس پڑتا۔ درحقیقت ہنسی مذاق سے محفل یا دربار کی رونق ختم ہوجاتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض باتوں میں بلبن نے انتہا پسندانہ روش اختیار کی لیکن اُس وقت ہندوستان کی مملکت اسلامی جن خطرات سے دوچار تھی ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک جری اور پُر ہیُبت بادشاہ، دلیرانہ پالیسی اور ایک مضبوط انتظامیہ کی ضرورت تھی۔ ان سے پہلے اسلامی حکومتوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ راجپوت، جاٹ، میواتی اور کھوکر موقعہ پاتے ہی ملک میں لوٹ مار کا بازار گرم کردیتے تھے اور ہر سال اس طرح کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آتا تھا۔ دہلی کے گرد نواح میں میواتیوں نے اس طرح بدامنی پھیلا رکھی تھی کہ ان کے ڈر سے شہر کے دروازے (Entry gates) بند کردیئے جاتے تھے۔ عام لوگوں میں کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ شام کے بعد شہر سے باہر جاسکے۔ کیونکہ یہ میواتی اکثر شام کے وقت ہی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کردیتے تھے۔ یہ لوگ شہر کے آس پاس جنگلوں میں چھپ جاتے اور رات کو شہر پر حملہ کرکے لوگوں کو حراسان اور پریشان کرتے تھے۔ بادشاہ نے ان رہزنوں اور ڈاکوؤں کا صفایا کرکے امن اور شانتی قائم کردی۔ ناصر الدین محمود کے زمانے میں منگول ہندوستان پریلغار کرتے تھے اور لاہور کو انہوں نے کئی بار لوٹا تھا۔ لیکن بلبن نے ان لٹیروں کا خاتمہ کردیا۔ ان اقدامات کا یہ اثر ہوا کہ ہلاکو خان جس کی آنکھیں ہندوستان کی طرف اٹھتی تھیں حملہ کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔ انہوں نے فوج میں ایک نظم و ضبط (Descipline) قائم کیا تھا۔ جگہ جگہ قلعے تعمیر کرائے اور سرحد کی حفاظت کے لئے فوج تائینات کی تاکہ ملک میں امن و امان برقرار رہے۔ ملک میں عدل و انصاف قائم کیا۔ امرأ غریبوں پر ظلم کرنے کی جرأت نہ کرسکتے تھے۔ کیونکہ ظالموں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ایک جاگیردار نے نوکر کو پٹائی کرکے ہلاک کردیا تھا۔ جب بادشاہ کو اس واقعے کی خبر ملی تو انہوں نے قاتل کو قتل کرواکے مقتول کے وارثوں کو انصاف دلایا۔

مذہب کی پیروی میں بھی بلبن کا عقیدہ مضبوط تھا۔ وہ باقاعدہ نماز پڑھتے تھے اور سفر میں کسر نماز کے ساتھ ساتھ ذکر و اذکار اور درود وظائف بھی پڑھتے تھے اور ہمیشہ باوضو رہتے تھے۔ وہ ایک منصف مزاج بادشاہ تھے۔ لیکن ملکی معاملات میں وہ علمائے کے مشوروں اور شرعی فیصلوں پر نہ چلتے تھے۔ بلکہ وہ شریعت اسلامی پر اپنی رائے کو مقدم رکھتے تھے جس کی وجہ سے انہیں لادین (Secular) سیاست کے حامیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو فقہ اور علم نحو، گرامر (Grammar) کے بجائے اپنی سلطنت کی محافظت کی خاطر میدان جنگ کے بہادروں اور کارگزاروں کی تربیت کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ سلطنت کی حفاظت کے لئے علمأ اور فقہا کی نہیں بلکہ ایک دفاعی طاقت (Defence force) یعنی مجاہدین اسلام کی ضرورت ہے۔ وہ ایک بارعب حکمران تھے۔ لوگوں کو ان کا زبردست احترام تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد چالیس (40) دن تک ان کے امرأ اور وزرأ ان کے مزار کے پاس فرشِ زمین پر ان کے احترام کے لئے سوتے رہے۔
(بحوالہ مورخ برنیؔ)

لیقباد خان کی تخت نشینی

بلبن کے دو بیٹے تھے ایک کا نام خان شہید اور دوسرے کا نام بغران خان تھا۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ خان شہید نہایت قابل اور ہونہار تھے۔ باپ نے انہیں منگولوں کی روک تھام کی ذمہ داری سونپی تھی۔ وہ اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے شہید ہوگئے۔ بیٹے کی وفات نے بلبن کی کمر توڑ دی لیکن وہ امور سلطنت میں مشغول رہتے تھے اور بیٹے کی جدائی کا درد لوگوں پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے بغران خان کو تخت نشینی کی اطلاع دے کر بنگال سے واپس بلایا۔ لیکن وہ باپ کے ساتھ تھوڑا سا عرصہ گزارنے کے بعد بنگال واپس چلا گیا۔ بیٹے کی اس عدم دلچسپی اور بے رَخی سے بلبن بہت رنجیدہ ہوا اور ان کی صحت مزید بگڑ گئی۔ انہوں نے وصیت کی کہ بغرانؔ خان بنگال کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میرے وفات کے بعد خان شہید کے بیٹے کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت پر عمل نہ کیا گیا اور اس کے برعکس بغران خان کے بیٹے کیقبار کو تخت سلطنت پر بٹھایا گیا۔

تخت نشینی کے وقت کیقباد کی عمر صرف اٹھارہ (18) سال تھی ان کی تربیت بلبن کے زیر اثر ایک ضابطے کے تحت ہوئی تھی۔ کم عمری کی وجہ سے انہیں تخت نشینی کی امید نہ تھی۔ لیکن قسمت نے ساتھ دیا کہ وہ سلطان بن گئے اور ان کی ساری پابندیاں ہٹادی گئیں اور جب انہیں عیش و عشرت کی آزادانہ زندگی یسر ہوئی تو انہوں نے عیاشی شروع کردی۔ ان کی عیاشیوں کی وجہ سے ایک سال کے عرصے میں ہی سلطنت کے اندر انتشارپیدا ہوا۔ ان کا یہ حال دیکھ کر بغران خان بیٹے کے پاس آگیا اور وعظ نصیحت کرکے انہیں صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی۔ انہیں تاکیدی کی آخرت پر ایمان رکھو حیلے بہانوں سے کام نہ لو۔ دنیا کی محبت کو اپنے آپ پر حاوی نہ ہونے دے نا۔ ان علمائ سے مشورہ نہ لو جنہیں دولتِ دنیا دین سے زیادہ عزیز ہو۔ شرعی احکام کی تعمیل کرو اور دنیاداری کو دین داری پر ترجیح نہ دو۔ دنیا کے مال و دولت کی حد سے زیادہ خواہش نہ کرو موت اور آخرت کی جوابدہی کو ہمیشہ یاد رکھو۔ اللہ کی بندگی کرتے رہو اور مسکینوں، یتیموں اور محتاجوں کی مالی مدد کرو اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرو۔ اس وعظ و نصیحت کے بعد بغران خان نے بیٹے کوپیار و محبت سے الوداع کیا اور خود بنگال تشریف لے گئے۔

کیقباد نے چند روزتک باپ کی نصیحت پر عمل کیا اور شراب نوشی و عیش کوشی سے اجتناب کیا لیکن کچھ دن بعد ہی وہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات کی مثال بن گئے کہ انہوں نے اپنا ماضی دہرانا شروع کردیا باپ کی ساری نصیحتوں کو بھول کر دوبارہ عیش و آرام کا بازار گرم کردیا۔ کچھ عرصہ تک ان کا یہی حال رہا پھر ان کی عیاشی اور بے دین سیاست نے رنگ لایا کہ مختصر وقت میں ہی ان کی جسمانی حالت خراب ہوگئی اور وہ گھومنے پھرنے کے لائق نہ رہے۔ اسی دوران ترکستان سے آئے ہوئے چند افراد نے خلجی امرأ کے اشاروں پر ایک ترکی کے خون کے قصاص میں اسے قتل کردیا اور ملک جلال الدین فیروز خلجی جو ایک با اثر امیر تھے تخت نشین ہوئے۔ اس طرح خاندان غلامان کا خاتمہ ہوا اور خلجی خاندان برسراقتدار آگیا۔

خلجی خاندان کا آغاز

جلال الدین خلجی

خاندان غلامان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں خلجی خاندان کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ اس خاندان کے پہلے بادشاہ جلال الدین خلجی تھے۔ اس وقت تک دکن مسلمانوں کی حکومت میں شامل نہیں تھا۔ جلال الدین خلجی نے دکن میں اسلامی حکومت قائم کردی۔

جلال الدین خلجی ایک رحمدل اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ وہ بڑھاپے میں تخت نشین ہوئے اور تخت نشین ہوتے ہی ان کا مزاج بدل گیا اور ان کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ انہوں نے سیاست میں پوری دلچسپی لینی شروع کردی۔ لیکن لڑائی بھڑائی، فتنہ و فساد اور جنگ و جدال میں انہوں نے کوئی دلچسپی نہ لی جب وہ پہلی بار شاہی محل میں پہنچ گئے تو گزرے ہوئے بادشاہوں کی یاد میں زار و قطار رو پڑے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے نے ان کے خلاف بغاوت کی تو وہ شکست کھاکر گرفتار ہوئے۔ لیکن بادشاہ نے نہ صرف یہ کہ انہیں چھوڑ دیا بلکہ پوری عزت و احترام کے ساتھ ملتان بھیجا۔ جہاں اسے ایک شاندار رہائش گاہ اور عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا۔ لیکن بادشاہ کا یہ طرز عمل وزرائ اور امرائ کو ناگوار گزرا کیونکہ بادشاہ نے ایک باغی کی حوصلہ افزائی کی۔ جس سے مخالفین کی ہمت بڑھ گئی اور ہر طرف سے دشمنوں کی یلغار ہوئی۔ لیکن بادشاہ نے یہ کہہ کر دشمنوں کا مقابلہ نہ کیا کہ وہ انسانوں کا خون بہانا نہیں چاہتے۔ بادشاہ کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاکر شرپسندوں نے ملک میں تخریب کاری کا بازار گرم کردیا اور پورے ملک میں فتنے اور فسادات شروع ہوگئے۔ بادشاہ کی حلیمی ان پر اس طرح غالب آچکی تھی کہ جب کسی ڈاکو یا تخریب کار کو بادشاہ کے سامنے لایا جاتا تو وہ اسے توبہ کرواکے رہا کردیتے یہ لوگ واپس جاکر پھر سے لوٹ مار کا بازار گرم کردیتے۔ بادشاہ کی ہمت اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ اگر کسی قاتل کو بھی ان کے دربار میں لایا جاتا تو وہ اسے بخش دیتا۔ اس طرح فتنے اور فسادات بڑھ گئے اور قتل و غارت میں اضافہ ہوگیا۔ یہ حال دیکھ کر لوگ ناراض ہوئے اور بادشاہ کے خلاف جگہ جگہ سازشیں شروع ہوگئیں اور فیصلہ ہوا کہ اسے معزول کیا جائے اور کسی اور کو تخت نشین کیا جائے۔ اسی دوران سیدی مولہ نامی درویش کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس نے حالات کو اور بگاڑ دیا۔ سیدی مولہ ایک ایرانی نسل درویش تھے جو ایران سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہوئے اور وہاں ایک بڑی خانقاہ تعمیر کروائی اور ایک بڑا لنگر جاری کیا جہاں ہزاروں لوگ اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے آتے تھے۔ یہ خانقاہ سیدی مولہ کی آمدنی کا ذریعہ بن گئی۔ اسی دوران لوگوں میں افواہ پھیل گئی کہ سیدی مولہ امرائ کی مدد سے بادشاہ کا تاج و تخت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو اس بغاوت میں حصہ لینے کے لئے اکسایا جب بادشاہ کو اس سازش کی اطلاع ملی تو انہوں نے سیدی مولہ اور ان کے حامیوں کو بلایا اور سازش کی تحقیق کی۔ انہوں نے اپنی بے گناہی کا اظہار کیا لیکن بادشاہ قائل نہ ہوا اور اپنی رحمدلی کو بھول کر انہونے سیدی مولا اور ان کے ساتھیوں کو آگ میں جلانے کا حکم

دے دیا تاکہ ثابت ہوجائے کہ اگر سیدی مولا اپنی بات میں سچا ہو تو یہ آگ ان کو نہ جلائے گی۔ علمائے وقت نے اس طریق کار کی یہ کہہ کر مخالفت کی کہ آگ ایک جلانے والی شئے ہے جو جھوٹ اور سچ بولنے والے دونوں کو جلا سکتی ہے اور یہ کام شریعت محمدیؐ کے خلاف ہے۔ اس پر بادشاہ نے اپنا فیصلہ ترک کردیا لیکن سیدی مولا کو اپنے ساتھیوں اور حامیوں سمیت ملک بدر کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن اسی اثنا میں سیدی مولا کو اس کے مخالفین نے قتل کردیا اور سلطان جلال الدین خلجی نے جن رشتہ داروں سے حسن سلوک کیا تھا وہ انہیں مہنگا پڑا کیونکہ ان ہی لوگوں نے ان کے داماد اور بھتیجے علاؤ الدین کو بہکایا جس نے مکر و فریب سے جلال الدین کو قتل کروا کر خود بادشاہ بن بیٹھے۔

علاؤ الدین خلجی سکندر ثانی

جلال الدین خلجی اور ان کے جانشین علاؤالدین خلجی کے درمیان اگر موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے متضاد (Opposite) تھے۔ علاؤ الدین خلجی نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں دیکھ لیا تھا کہ ایک نرم دل بادشاہ کی حکومت میں کس طرح ملکی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک عام و خاص تخت شاہی کا خواب دیکھتا ہے۔ اس حقیقت کےپیش نظر انہوں نے جلال الدیدن خلجی سابق خلیفہ کے طریقہ کار اور انتظام (Administration) کو یکسر بدل دیا اور اپنے دشمنوں اور باغیوں کو جلال الدین کی طرح عہدے اور جاگیریں دے کر منوانے کی غلطی نہ کی بلکہ انہیں اس طرح عبرت ناک سزائیں دی کہ ملک میں خوف و ہراس پھیل گیا اور کسی دوست یا دشمن نے حکومت کے خلاف بات کرنے کی جرأت نہ کی۔ جب جالوؔر میں سپاہیوں نے سپاہ سالار نصرت خان کے خلاف بغاوت کی تو بادشاہ نے نہ صرف ان باغیوں کو قرار واقعی سزا دی بلکہ ان کے اہل و عیال کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ حالانکہ ایسا کرنا شرعاً جائزنہ تھا۔ ان کی سخت مزاجی کا ایک اور واقعہ ہے کہ انہوں نے مغل نو مسلموں کا قتل عام کرایا۔ یہ لوگ 691ھ میں جلال الدین کے دور حکومت میں بحیثیت حملہ آور ہندوستان آئے تھے۔ لیکن شکست کھاکر قیدی بن چکے تھے۔ بادشاہ جلال الدین نے ان سے ہمدردی کا ایسا سلوک کیا تھا کہ نہ صرف ان کو رہا کیا بلکہ ہندوستان میں بسایا تھا۔ یہ لوگ مسلمان ہوئے تھے اور انہیں نو مسلم کہا جاتا تھا۔ علاؤ الدین کے عہد حکومت میں انہوں نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنے والے کی ایک جماعت کی مدد کی بادشاہ کو جب اس سازش کا پتہ چلا تو انہوں نے حکم دیا کہ سلطنت میں جہاں کوئی نو مسلم ملے اسے قتل کردیا جائے اور اس کی ساری جائیداد اس کے قاتل کے حوالے کی جائے۔ لوگوں نے جائیداد حاصل کرنے کی لالچ میں ان نومسلموں کا قتل عام کردیا اور صفۂ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹادیا۔

علاؤ الدین ایک تند مزاج بادشاہ تھے۔ اگر کوئی شخص ان کی مخالفت کرتا یا ملک میں فساد ڈالنے کی کوشش کرتا تو وہ جلال الدین کی طرح انہیں بلا تعامل معاف نہیں کرتے بلکہ ان کا محاسبہ کرکے انہیں بدترین سزا دینے کا حکم دیتے تھے۔ لیکن اس سخت مزاجی کے باوجود ان میں اعلیٰ حکمران ہونے کی خوبیاں پائی جاتی تھیں اور وہ ایک اولوالعظم محنتی، صاحب تدبیر اور ایک عظیم حکمران اور فاتح تھے۔ ہندوستان کے جتنے علاقے ان کے زیر نگین تھے برطانوی حکومت کے بغیر اتنے علاقے کسی اور حکمران کے پاس نہ تھے۔ وہ نہ صرف ایک بہادر سپاہ سالار اور فاتح حکمران تھے بلکہ ایک کامیاب منتظم (Administrator) بھی تھے۔ ان کی انتظامی قابلیت اور مدبرانہ کاروائیوں کی بہترین مثال وہ اصلاحات ہیں جو انہوں نے اجناس کی قیمتوں میں اعتدال پیدا کرکے عمل میں لائیں جس سے ملک کے معاشی حالات ٹھیک رہے اور کسی اندرونی شورش و بغاوت کا خدشہ نہ رہا۔ اجناس کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اور مہنگائی آج کل کے زمانے میں بھی حکومتوں کا ایک اہم مسئلہ اور درد سر ہوتا ہے۔ لیکن آج سے آٹھ سو سال پہلے علاؤالدین نے قواعد و ضوابط وضع کرکے اس مسئلے کو حل کردیا۔

سلطان سکندر ثانی علاؤ الدین خلجی کوئی بڑے عالم نہ تھے۔ لیکن انہیں صورت حال پرکھنے کی پوری صلاحیت تھی۔ انہوں نے فوج کو مستحکم کیا اور ملک بھر میں قلعے تعمیر کروائے۔ ملکی فتوحات کے لئے وہ خود دارالسلطنت کو چھوڑ کر نہیں جاتے تھے بلکہ اس کام کے لئے جرنیلوں کو بھیجتے تھے۔ ان کی یہ تدبیریں کامیاب رہیں۔ ملک میں بادشاہ کی موجودگی میں کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ کوئی فتنہ اٹھاتا۔ ان کے قہر و ظلم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہلاکو خان سے کم نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ رحمدلی اور شرافت دکھانے سے حملہ آوروں اور باغیوں کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ جلال الدین خلجی نے جن منگولوں سے رحمدلی کا برتاؤ کیا تھا وہ ہمیشہ ہندوستان آتے رہے اور لوگوں کو پریشان کرتے رہے۔ اور اس طرح بادشاہ کی رحمدلی کا فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو کمزور کردیا۔ ان کا عہد حکومت تین ادوار پر مشتمل تھا۔ پہلا دور ابتدائی فتوحات کا زمانہ جس میں انہوں نے منگولوں کو شکست دی۔ دوسرے دور میں انہونے ملک کے اندرونی اصلاحات پر توجہ دی اور تیسرے دور میں انہوں نے شمالی ہندوستان کے معاملات کو بحسن خوبی سلجھا کر دکن کو پوری طرح فتح کیا اور جنوبی ہند کی سلطنتوں کو فتح کرکے ان کے راجاؤں کو باجگزار بنایا۔

سلطان علاؤ الدین کی کارگزاری اور صفات

سلطان علاؤ الدین اگرچہ سخت مزاج تھے لیکن ان میں کارکردگی کے چند اچھی صفات بھی تھیں۔ وہ عام رعایا کے لئے خدا کی رحمت تھے۔ ان کے دور حکومت میں رعایا اکثر خوشحال رہتی تھی۔ کیونکہ ان کے زرعی اصلاحات کی وجہ سے غلے اور اناج کی فراوانی تھی۔ انہوں نے غیر معمولی فتوحات کئے اور منگول حملہ آوروں کا قلع قمع کیا۔ مغرور اور متکبر لوگوں پر غضب کیا۔ غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں پر رحم کیا۔ ان کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ اس طرح ملک میں امن و امان قائم کیا۔ تاجروں اور دوکانداروں کو مہنگے داموں غلہ بیچنے پر پابندی عائد کردی جس سے غلہ ارزانی ہوگئی۔ نئی عمارتیں مسجدیں اور قلعے تعمیر کئے الغرض انہوں نے ملک کو خوشحال بنادیا اور امن و امان قائم کیا۔ اس لئے بادشاہ کی وفات کے بعد لوگ ان کے عہد حکومت کو فخر سے یاد کرتے تھے۔

سلطان نے اپنے مقاصد میں جو بے مثال کامیابی حاصل کی اس کی ایک بڑی وجہ ان کی انتظامی قابلیت اور تجربہ کار مشیروں کی مشاورت تھی۔ ان کا مزاج سخت تھا لیکن اس کے باوجود وہ مشیروں کے مشورے غور سے سنتے تھے۔ اگرچہ یہ مشورے کبھی کبھار ان کے ذاتی مفاد کے خلاف اور ناپسند ہوتے تھے۔ جو مشورے ان کے لئے مفید ہوتے تھے۔ انہیں وہ چراغ راہ بناتے جب ان کو ابتدائی ایام میں ہی لگاتار کامیابیاں نصیب ہوئیں تو ان کے دل ودماغ کو غرور اور تکبر کی آمیزش نے گھیر لیا۔ ان کے دل میں طرح طرح کی خواہشات ابھر آئیں۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے چار یارِ باوفا عطا کئے تھے جن کی مدد سے انہوں نے شریعت کا آغاز کیا۔ تو میرے بھی چار وفادار دوست ہیں اس لئے میں بھی ان چار وفادار دوستوں الماسؔ بیگ، الغؔ خان، ظفرؔ خان، ملکؔ، نصرتؔ خان کی مدد سے ایک نئے دین کی بنیاد ڈالوں تاکہ قیامت تک میرا نام زندہ رہے اور لوگ میرے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ ان کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ ان کے پاس بے شمار دولت اور لاؤ لشکر ہے۔ اس لئے وہ یونان کے بادشاہ سکندر کی طرح عالمگیر فتوحات کا آغاز کرکے سکندر اعظم کہلائے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کئی مسلسل کامیابیوں کے بعد اپنے آپ کو سکندر ثانی کہلوایا اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ لیکن ان کے ایک وزیر علاؔ الملک جب بادشاہ کے اس نامناسب منصوبے سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے نہایت جرأت اور عقلمندی سے بادشاہ کو سمجھایا کہ آپ کے اس منصوبے سے پورا ہندوستان آپ کے خلاف ہوگا کیونکہ دین اور شریعت کا انحصار اللہ کی طرف بھیجی گئی وحی پر ہے اور نزول وحی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگئی جس پر سارے مسلمانوں کو یقین کامل ہے اور آپ کے اس پلان کو نبوت کا دعویٰ تصور کیا جائے گا جس سے ملک میں افراتفری اور بدامنی پھیل جائے گی اور ملک بدنظمی اور فساد کا شکار ہوجائے گا۔ لہٰذا ملکی سیاست اور حکومت کی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ سلطان اس ارادے کو ترک کرلیں اور اس طرح کا خیال ذہن میں کبھی نہ آنے دیں۔ ورنہ چنگیز خان اور ان کی اولاد نے سالہا سال تک اس امر کی بڑی کوشش کی کہ مذہب اسلام خدانخواستہ دنیا سے نابود ہوجائے اور ان کا قائم کردہ اپنا دین جو سالہا سال تک ترکستان میں رائج تھا قائم ہوجائے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ لیکن ان کی یہ خواہش کسی بھی طرح پوری نہ ہوسکی اور آخرکار اللہ کی مرضی سے ان کی اولاد کے دل میں دین محمدؐ ذہن نشین ہوا اور وہ سب کے سب مسلمان ہوگئے۔ اسلام کی تقویت اور اشاعت کے لئے انہوں

نے کافروں سے لڑکر اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر پوری دنیا کو اسلام کی نعمت سے روشناس کیا اور اللہ کی رضامندی اور جنتوں کی نعمتیں حاصل کیں۔ علاألملک کی اس سبق آموز نصیحت سے سکندر علاؤالدین کا دماغ حقیقت کے چراغ سے روشن ہوگیا اور انہوں نے اپنے خیال کو یکسر بدل دیا اور خوش ہوکر اپنی اصلیت پر واپس آگئے۔

علاؤ الدین کا نظریہ اسلام

علاؤالدین ایک باصلاحیت منتظم بادشاہ تھے۔ ان کی فتوحات سے اسلامی حکومت کو وسعت ملی اور استحکام حاصل ہوا۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اسلام اور اسلامی حکومت سے کوئی گہری دلچسپی نہ تھی۔ وہ بزرگان دین کا تھوڑا بہت احترام تو کرتے تھے لیکن انہیں دنیا پرستی اور مادیت سے بہت لگاؤ تھا۔ اگرچہ بزرگان دین کے مشوروں سے ہی انہوں نے ملک میں شراب کی محفلیں بند کردیں لیکن یہ ان کا شرعی قوانین کا احترام نہ تھا بلکہ اس میں ملک کی سیاست اور مصالحت زیر غور تھی کہ جب بادشاہ کے خلاف ان کی غیر اسلامی حرکتوں کی وجہ سے مخالفت ہونے لگی تو انہوں نے شراب خوری بند کردی اور اس پر سختی سے عمل کرنے کا حکم جاری کیا۔ وہ مذہبی قسم کے آدمی نہ تھے اور نہ وہ شریعت اسلامی کے پابند تھے۔ لیکن وہ مکمل طور لامذہب (Athiest) بھی نہ تھے بلکہ وہ سیکولر (Secular) مزاج کے آدمی تھے۔ ان کے دور حکومت کے ایک قلم کار لکھتے ہیں کہ وہ مذہبی عالموں، قاضیوں اور مفتیوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ اتنی قابلیت نہیں رکھتے کہ یہ ملک کے مسائل سمجھ سکیں۔ اس لئے یہ بادشاہ کا کام ہے کہ وہ ملک کے لئے قوانین نافذ کرے، شریعت اور اہل شریعت کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔ البتہ لڑائی جھگڑوں، مقدموں کا تصفیہ اور طریق عبادت بتانا قاضیوں اور علما کا کام ہے۔ اس نکتہ نظر سے بادشاہ علمائ کے فتوے کے بغیر ملک کے فیصلہ جات کرتے لیکن اس کے باوجود انہیں ملک کے اعلیٰ پایہ مفتی قاضی مغیث الدین بیانوی جو اس زمانے کے مشہور عالم تھے سے بعض اہم مسئلوں کے متعلق شریعت کے احکام پوچھنے کی ضرورت پڑی کہ انہوں نے بادشاہ کو دینی مسائل اور احکام کے علاوہ عام لوگوں اور مظلوموں کی داد رسی کے حقوق سمجھائے جس پر بادشاہ راضی ہوگیا اور اس طرح عام لوگوں کی داد رسی ہونے لگی اور انہیں انصاف فراہم ہونے کی امید بڑھ گئی۔

خلجی خاندان کا خاتمہ

سلطان علاؤ الدین خلجی میں بعض نقائص کے باوجود کئی خوبیاں تھیں۔ لیکن یہ خوبیاں موروثی حکومت کی خرابیوں اور خامیوں کے نیچے دب چکی تھیں۔ ان خرابیوں اور خامیوں کی وجہ سے ہی سلطان کا انجام بڑا عبرت ناک ہوا۔ چونکہ مسلسل جنگی کامیابیوں نے بادشاہ کا دماغ آسمان پر چڑھایا تھا۔ اس لئے وہ اختلاف رائے کو برداشت نہ کرکے اپنی رائے ٹھونس دیتے تھے۔ اس لئے آہستہ آہستہ ان کی مجلس خیر خواہ مشیروں سے خالی ہوگئی تھی۔ بادشاہ سخت بیمار پڑگئے اور ان کی عقل سلیم پر بیماری نے پردہ ڈال دیا۔ ان کی بیوی ملکہ جہاں اور بیٹا خضر خان ولی عہد رنگ رلیوں میں مصروف تھے۔ انہیں حکومت کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ سپاہ سالار ملکؔ کافور نے موقعہ غنیمت جان کر شہزادہ خضر خان اور ملکہ جہاں کو قید میں ڈالوا دیا۔ اسی دوران سلطان علاؤ الدین بتاریخ 8جنوری 1316ئ اس جہان فانی سے انتقال کرگئے اور سلطان کی وفات کے دوسرے دن سپاہ سالار ملکؔ کافور نے خضر خان کو معذول کرکے ان کے کم عمر بھائی شہزادہ شہاب الدین کو تخت شاہی پر بٹھایا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہی اسے قتل کردیا گیا اور ان کے جانشین شہزادہ قطب الدین مبارک شاہ تخت نشین ہوئے۔

قطب الدین مبارک شاہ

سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی ابتدا اچھی تھی لیکن بہت جلد ان پر نامبارک اثرات غالب آگئے۔ جب تخت کے سارے دعوے دار ختم ہوگئے تو وہ بری طرح عیاشی اور نفس پرستی میں بتلا ہوگئے۔ وہ اکثر رنگ رلیوں میں وقت گزارتے تھے اور دربار میں زنانہ کپڑے پہن کر آتے اور معزز امرائ اور درباریوں کے ساتھ تمسخری اور ٹھٹھے مذاق کرتے۔ ان کے بچگانہ مزاج نے انہیں زیادہ دیر تک تخت شاہی پر رہنے نہ دیا۔ آخر کار ان کے دربار کے ایک نو مسلم غلام خسرو خان نے تخت شاہی کی ہوس میں آکر انہیں قتل کردیا اور پھر ان کے سارے افراد کو قتل کرواکے پورے خاندان کا صفایا کردیا اور اس طرح خلجی خاندان کے حکمرانوں کا خاتمہ ہوگیا اور خسرو خان نے ناصر الدین کا لقب اختیار کرکے سلطنت کا شاہی تاج سر پر رکھا۔

سلطان ناصر الدین خسرو

خسرو کا معنی شہنشاہ ہے۔ ناصر الدین خسرو خان کا لقب اور نام مسلمانوں کا تھا۔ لیکن وہ دل سے مسلمان نہ تھے۔ وہ نام کے مسلمان اور کام کے کافر تھے۔ انہوں نے جو اپنے پریوار اور ہم قوم گجرات سے اپنے پاس بلائے وہ سب نام کے مسلمان تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کردیا۔ مسجدوں کی محرابوں میں بت رکھوائے اور قرآن مجید کی کتابوں کو اوپر تلے رکھ کر گھٹا بنا کر ان سے تکیوں کا کام لیتے تھے۔ یہ دور اسلام کے لئے بڑا نازک دور تھا اس کا ذکر کیمبرج ہسٹری (Cambridge History) میں اس طرح کیا گیا ہے ۔ اردو ترجمہ ''اسلام کو اس وقت ایک سرپرست کی بڑی ضرورت تھی جب خسروؔ کی ساری جماعت میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا اسلام برائے نام نہ ہو اور بعض نے تو اسلام قبول ہی نہ کیا تھا۔ دربار میں علانیہ بت پرستی ہوتی اور مذہب اسلام کی توہین کی جاتی۔ مسلمان مورخین ان واقعات کا بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ ذکر کرتے ہیں مسجدوں کی بے حرمتی ہوتی یا انہیں مسمار کیا جاتا اور اسلام کی مقدس کتابیں کرسیوں اور اسٹولوں کی طرح بیٹھنے کے لئے استعمال کی جاتیں''۔

ضیاالدین برنیؒ اپنی تصنیفات میں اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ناصر الدین خسروؔ کا پلان شمالی ہندوستان میں از سر نو ہندو اقتدار قائم کرنا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ ایسا نازک دور تھا جو انہیں دہلی کی سلطنت کے آغاز سے اب تک کبھی نہ دیکھنا پڑا تھا یہ مسلمانوں کی خوش نصیبی تھی کہ خسرو کے ناپاک ارادوں کو اللہ تعالیٰ نے ناکام کرکے خاک میں ملادیا جب خدا کے ایک نیک بندے غازی ملک فخرالدینؒ ایک سچے مسلمان اور خلجی خاندان کے وفادار خسرو کے خلاف اٹھے۔ خسرو خان کی اسلام دشمن پالیسی اور مظالم سے انہیں بڑا رنج ہو اور انہوں نے اس ظالم حکمران کو صفۂ ہستی سے مٹانے کے لئے کمر کسا انہوں نے ہر طرف کے امیروں رئیسوں کو اس نازک صورت حال سے نمٹنے کے لئےپیغام بھیجے اور ان سے مدد کی درخواست کی۔ بعض لوگونے ذاتی مصلحتوں اور مفادوں کی وجہ سے ساتھ نہ دیا لیکن جو اسلامی حکومت کے ہمدرد تھے انہوں نے فوجیں بھیجیں جنہیں ساتھ لے کر غازی ملک فخرالدین دہلی کی سلطنت کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی کی فوج نے نارائین نارائین کے نعرے لگائے لیکن اکثریت کے باوجود خسرو کی فوج پسپا ہوئی پھر انہوں نے سپاہیوں کو لڑائی پر آمادہ کرنے کے لئے شاہی خزانے کے منہ کھول دئے۔ انہیں کئی مہینوں کی تنخواہیں پیشگی ادا کی تاکہ وہ جان فشانی سے لڑیں لیکن غازی ملک کی شاندار قیادت میں خسرو کو بڑے لاؤ لشکر کے باوجود شکست فاش ہوئی اور ہندوستان کی حکومت اس منحوس اور بے دین بادشاہ کے چنگل سے نکل کر ایک دین دار اور معزز بادشاہ کے ہاتھ آگئی۔ اس کے بعد غازی ملک نے خلجی خاندان کے وارثوں کی تلاش کی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ظالم خسرو نے اس خاندان کا بچہ بچہ قتل کروایا تھا تو علمائ اور امرائ کے اسرار پر وہ خود تخت نشین ہوئے اس طرح تغلق خاندان کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔

تغلق خاندان کی ابتدا

سلطان غیاث الدین تغلق

ناصر الدین خسرو خان کی حکومت کے خاتمے کے بعد غازی ملک فخر الدین سلطان غیاث الدین کے نام سے تخت نشین ہوئے وہ ایک کٹر (Staunch) مسلمان تھے۔ وہ ایک غریب والدین کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن اپنی ذہانت اور فہم و فراست سے انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ بیت المال کو درست کیا چونکہ خسرو نے شاہی خزانے کو پہلے ہی خالی کردیا تھا۔ انہوں نے سپاہیوں کو مہینوں اور سالوں کی تنخواہ پیشگی واگزار کی تھی اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے امرائ اور با اثر لوگوں میں ذر کثیر بانٹ دیا تھا۔ سلطان کو اس رقم کی بازیابی کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ خسرو کے ہاتھوں ملک میں جو اقتصادی بحران پیدا ہوا تھا سلطان کو اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان ساری مشکلوں کو حل کرنے کے بعد انہوں نے سلطنت کے انتظام پر دھیان دیا۔ ان کے نظم و نسق (Administration) کا اندازہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اپنی تاریخ میں انہوں نے کسی بادشاہ کی تعریف میں کوئی ایک جملہ بھی نہ لکھا مگر سلطان غیاث الدین کی سلطنت کے بارے میں وہ یوں رقمطراز ہیں ''سلطان غیاث الدین کی سلطنت کا انتظام انصاف اور میان روی پر مبنی تھا انہوں نے مال گزاری کے لئے اصول وضع کئے اور اس امر کی بڑی احتیاط کی کہ کہیں اس سے خرابیاں پیدا نہ ہوں۔ خسرو نے جو جاگیریں اپنے رشتہ داروں اور من پسند لوگوں میں تقسیم کی تھیں وہ ان سے واپس لے لیں جس سے ملک کی مالی حالات ٹھیک ہوگئی۔ کاشتکاروں سے نیک سلوک کیا اور بد عنوان رشوت خور سرکاری افسران پر زبردست کاروائیاں کرکے انہیں سخت ترین سزائیں دی۔ اس طرح عدالت اور پولیس کا کام تسلی بخش رہا اور ملک کے دور دراز حصّوں میں پرلے درجے کا امن و امان قائم ہوگیا۔

مسلمان مورخوں کی نظروں میں سلطان غیاث الدین ایک ہونہار قابل، باوصف اور باصلاحیت بادشاہ ہونے کے علاوہ ایک مَتدّین یعنی دیندار، ایماندار، معاملہ فہم اور سچے مسلمان تھے۔ وہ ارکان شریعت کے پابند تھے اور خلجیوں کے زمانے میں جو مذہبی بدعنوانیاں شروع ہوگئی تھیں انہوں نے اپنے جانشینوں کے ساتھ ملکر ان کی اصلاح کی اس اصلاحی مہم میں جب سلطان نےبیت المال کو دوبارہ استوار کرنا شروع کیا تو اس کاروائی میں جب انہوں نے دیکھا کہ خسرو کی حکومت میں سپاہیوں کو نہ صرف تین تین سال کی تنخواہیں پیشگی واگزار کی گئی تھیں بلکہ دہلی کے بااثر فقرا اور مشائخ سے حصول دعا کے لئے بڑی بڑی رقمیں بطور نذرانہ اور ہدیہ دی گئی تھیں اور ان مشایخ میں سے تین بزرگوں سید علاؤالدین، شیخ وحید الدین اور شیخ فرید الدین نے اس بدکار، نالائق اور اسلام دشمن بادشاہ کے نذرانے لینے سے صاف انکار کردیا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض مشائخ نے نذرانے تو لئے تھے لیکن جب ملک غیاث الدین تخت نشین ہوئے تو انہوں نے نذرانے کی رقمیں واپس کردیں تھی۔ بعض بزرگوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ ان فقرأ اور مشائخ کو سرور (نشہ چڑھانے والے سنگیت) سننے کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ سرور اور دیگر ساز اور راگ والے گانے بجانے اسلام میں حرام ہیں۔ بادشاہ نے جب ان خلاف شریعت کاموں پرپابندی لگادی تو مشائخ حضرات نے سَرور سَننے کے حق میں ایک غلط اور جھوٹی حدیث پیش کی بادشاہ نے ان سرور اور گانے بجانے والوں کا عمل حکومت کی حکمت عملی کےپیش نظر فی الحال التوا میں رکھدیا۔ اس دوران سلطان کو بنگال کے سفر پر جانا پڑا تو جب وہ اس سفر سے واپس آرہے تھے تو دہلی کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنے بیٹے اَلغ خان کے تعمیر کردہ محل میں قیام کیا۔ بادشاہ کے داخل ہونے کی پہلی رات میں عجلت (Emergency) میں تیارہ کیا گیا محل گر پڑا اور بادشاہ مسمار ہوئے محل کے ملبے میں دب کر شہید ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ اس حادثے پر طرح طرح کی باتوں کی تیراندازی کی گئی۔ بعض مورخین نے ان کے بیٹے الغ خان کو جو بعد میں سلطان محمد تغلق کے نام سے بادشاہ ہوئے اپنے باپ کا قاتل ٹھہرایا اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بادشاہ کی موت ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ اس لئے اس موت کے لئے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے اور ان کی موت کی وجہ مشتبہ رہی لیکن اکثر مورخین کا خیال ہے کہ غیاث الدین تغلق کی موت ایک ناگہانی اور اتفاقی حادثہ کی وجہ سے ہوئی۔ ان کی موت کے بارے میں ایک قیاس آرائی یہ بھی ہے کہ بادشاہ بنگال سے دہلی آرہے تھے تو انہوں نے حضرت سلطان

مشائخ نظام الدین اولیا کو اطلاع دی تھی کہ میرے دہلی پہنچنے سے پہلے آپ میرے استقبال کے لئے دہلی پہنچ جائیں اور شیخ نے جواب دیا تھاہنوز دہلی دور است یعنی ابھی دہلی دور ہے۔ اس واقعہ کے متعلق نظام الدین، کے حامی تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جب بادشاہ لکھنو آرہے تھے تو انہوں نے سلطان مشائخ نظام الدین اولیائ کو جو اطلاع دی تھی کہ مجھ سے پہلے دہلی پہنچ کر میرا استقبال کریں اور شیخ نے جواب دیا تھا۔ ہنوز دہلی دور است۔ ابھی دہلی دور ہے اور بادشاہ راستے میں ہی حادثے کا شکار ہوا یہ نظام الدین اولیائ کی کرامت تھی کہ بادشاہ دہلی نہ پہنچ پائیں گے۔ لیکن یورپین، یورپی مصنف باپ کو ہلاک کرنے کے لئے بیٹے الغ خان کی سازش قرار دے کر الغ خان کی کردار کشی (Character assisnation) کا کام کرتے ہیں اور بادشاہ کے حامیوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کرتے ہیں۔ مورخ بدایونی اسے ایک مشہور افواہ قرار دیتے ہیں۔

نظام الدین اولیاءؒ کو بادشاہ کی ہلاکت کی سازش میں ملوث کرنا اس حیثیت سے بھی نامناسب ہے کہ بادشاہ دہلی سے باہر ہونے کی صورت میں نظام الدین کو اپنے پہنچنے سے پہلے دہلی پہنچنے کے لئے نہ کہتے کیونکہ بادشاہ خود دارالخلافہ سے باہر ہونے کے دوران سلطنت کے بااثر شیخ کو ناراض کرکے اپنے لئے مشکلیں اور خطرات مول لینے کے لئے تیار نہ ہوسکتے تھے۔ مورخ برنیؔ نظام الدین اولیاءؒ کے پرجوش معتقد مرید تھے مگر اس واقعہ کے متعلق خاموش رہے لیکن ڈاکٹر مرزا نے امیر خسرو کے متعلق ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے اس حکایت کے متعلق شک وشبہ ظاہر کیا ان کا کہنا ہے کہ نظام الدین اولیاءؒ اور بادشاہ کے درمیان کوئی تنازہ اور عداوت نہ تھی اور نظام الدینؒ کی عمر اُس وقت پچانوے (95) سال کی تھی اور وہ بیمار بھی تھے۔ ان حالات میں ان کا کسی کشمکش اور مباحثہ میں حصہ لینا اور بادشاہ کی بلاوجہ شکایت کرکے دشمنوں کو عداوت میں رکھنے اور تنقید کرنے کا موقعہ دینا بہت نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال سلطان غیاث الدین کی وفات کی کوئی بھی وجہ ہو اسلامی حکومت ہندوستان کے لئے ان کی موت ایک بڑی مصیبت تھی اور سلطان کی وفات کے ساتھ اسلامی حکومت کی وسعت اور اہمیت ختم ہوگئی ۔ سلطان نے ملک کے ہر خطے کو قابو میں رکھا تھا۔ لیکن سلطان محمد تغلق جب فرمانروا ہوئے تو ان کے عہد حکومت میں بغاوتیں شروع ہوئیں کئی صوبے دہلی سے آزاد ہوئے اور سلطنت وسیع ہونے کے بجائے کمزور ہونے لگی۔ سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے مورخ برنیؔ نے فرمایا۔ از مردن سلطان تغلق بروئے جہاں خرابی نمود۔ یعنی سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال سے دنیا بھر میں خرابی ہوئی۔

سلطان محمد تغلق

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات کے بعد محمد تغلق ہندوستان کے تخت نشین ہوئے مورخین کے لئے ان کی شخصیت مبہم ہے۔ وہ حافظ قرآن تھے۔ صوم و صلوۃ اور شریعت کے پابند تھے۔ عربی اور فارسی کے ماہر تھے اور ان زبانوں میں خطوط لکھتے تھے۔ ان کے سیاسی کردار کے متعلق ڈاکٹر تارا چند اپنی کتاب مختصر تاریخ اہل ہند جو انگریزی زبان میں ہے لکھتے ہیں: اردو ترجمہ۔ وہ اپنے مذہب کی پوری طرح کی پیروی کرتے تھے اور ان کی گھریلو زندگی بے عیب تھی۔ وہ متعصب نہ تھے۔ تنگ نظر علمائ اور فقہا کی رائے کو اہمیت نہ دیتے تھے اور ہندوؤں کے ساتھ انہوں نے رواداری کا سلوک کیا۔ انہوں نے ان کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور ستی کی رسم کو موقوف کرنا چاہا۔ ایک ہندو کو انہوں نے گورنر مقرر کیا اور دوسروں کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ ان کی قابلیت اور جدت طبعیت یعنی نئی سوچ و سمجھ کی مزاج ان کے سب دوست اور دشمن تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود لوگوں کی اس تنقید کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے دور حکومت میں ملک اور ملکی سیاست کو فایدے کے بجائے نقصان زیادہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بادشاہ جس کام کا ارادہ کرتے اس پر وہ انتہائی شدت سے کاربند رہتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کچھ ایسے کارنامے انجام دئے جو کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے مشیروں اور وزیروں کے مشوروں کو نظر انداز کرکے اپنی مرضی پر بضد رہنے سے ان کے اکثر ارادے اور پلان ناکام رہے۔ جیسا کہ انہوں نے دہلی کو چھوڑ کر دولت آباد کو اپنا دارالخلافہ بنانے کا اس وجہ سے پلان کیا کہ دولت آباد دہلی کی نسبت مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں سے سارے ملک کا انتظام چلانا آسان ہوگا۔ لیکن اس کاروائی میں انہیں بہت ساری مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ دوران سفر بوڑھے بچوں اور عورتوں کو زبردست تکلیف پہنچی کیونکہ یہ بزرگ لوگ لمبا سفر کرنے کی قوت برداشت نہ رکھنے کی وجہ سے راستے میں بیمار ہوگئے اور ان میں اکثر بیماری اور تکالیف کی تاب نہ لاکر راستے میں ہی چل بسے۔

سلطان کی ان نامناسب اور نامعقول کاروائیوں سے نہ صرف عوام کو تکلیف پہنچی بلکہ ملک میں بدامنی اور بد نظمی پھیل گئی جس کی وجہ سے ملک کے کئی صوبے دہلی کے اقتدار سے چھوٹ گئے اور پھر ان صوبوں کو دوبارہ فتح کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ اس طرح سلطان کی ان غیر معقول کاروائیوں سے ملک کے سیاسی حالات پر بَرا اثر پڑا اور اس پر طرّہ انوکھی بات یہ ہے کہ ان کاروائیوں اور منصوبوں میں تمام مشائخ اور صوفیہ شیخوں اور صوفیوں نے بھرپور ساتھ دیا۔ چونکہ بادشاہ کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں ان شیوخ حضرات اور صوفیائے کرام کا بڑا اثر تھا۔ اگرچہ بادشاہ ان کے معتقد نہ تھے لیکن پھر بھی ملکی مصلحت کے پیش نظر بادشاہ کو ان کا احترام کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ بعض سابقہ خوش عقیدہ بادشاہ اور امرأ کرامت اولیا کے پوری طرح قائل تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ ان فقرا اور شیوخ کو ناراض کریں تو وہ زوال اور مصیبت کے شکار ہوجائیں۔ سلطان علاؤ الدین خلجی جیسے سخت مزاج بادشاہ بھی ان فقرأ اور مشائخ کی ناراضگی سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس کا اظہار مورخ برنیؔ اس طرح کرتے ہیں کہ جب درنگل سے علاؤالدین کی فوجیں دیر تک واپس نہ لوٹ آئیں اور نہ ان کے بارے میں کوئی خبر آئی تو بادشاہ نے پریشان ہوکر سلطان مشائخ نظام الدین اولیا کی خدمت میں قاصد بھیجا چونکہ علاؤ الدین ایک لامذہب اور خود سر بادشاہ تھے اور مذہبی بزرگوں کا ان کے دل میں کوئی احترام نہ تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے مذہبی رہنماؤں کا پاس کیا۔ نظام الدین اولیا سے انہوں نے کئی بار ملنے کی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے مصلحت پسندی سے کام لے کر بادشاہ کو ملاقات دینے سے ٹال مٹول کیا لیکن اس کے باوجود بادشاہ نے ان کے اس رویہ کو برا نہ مانا اور ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ لیکن ملاقات کا ارادہ ترک کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہر عام خاص سمجھتا تھا کہ ہر سیاہ و سفید کی کنجی خدا دوست اہل دل درویشوں اور بزرگوں کے پاس ہے اور ان سے عقیدت کا اظہار کر کے اپنا دین و دنیا ٹھیک کرنا چاہیے یہ زمانہ خوش اعقادی یعنی پیر فقیروں اور شیخوں درویشوں پر اعتقاد رکھنے کا زمانہ تھا۔ کہ وہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو کسی بھی بیماری یا مصیبت سے نجات دلاسکتے ہیں۔ اور اس عقیدے میں سلطان مشائخ شیخوں کا بادشاہ نظام الدین اولیا روحانیت اور تقدس کے سمندر مانے جاتے تھے اور علم و فضل میں بھی وہ شہرت یافتہ تھے اور وقت کے بہترین شاعر امیر خسرو کے علاوہ مورخ ضیاالدین برنی اور مشہور عالم دین مولانا فخر الدین ان کے عقیدت مند تھے۔ صوفی لوگوں بالخصوص سلطان

مشائخ حضرت نظام الدین اولیا کا اثر اس قدر زیادہ تھا کہ خاص و عام کے دلوں پر ان کی حکومت تھی۔

ان صوفی حضرات کا اثر کم کرنے کے لئے سلطان محمد تغلق نے ایک بڑا قدم اٹھایا کہ انہیں اپنے ماتحت کردیا اور اپنی مرضی کے مطابق انہیں خدمت کرنے کی ذمہ داریاں عائد کیں اور جو کوئی اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کرتا اس کے ساتھ سختی سے نپٹا جاتا تھا۔ اس طرح انھوں نے ان شیخوں اور عالموں کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے پر مجبور کردیا۔ ان میں سے اکثر کو شاہی محل میں کپڑے دھونے اور صفائی کا کام کرنے پر مقرر کیا۔ اگر کوئی انکار کرتا تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا۔ اس خدمت گزاری کا سلطان کو یہ مقصد تھا کہ ان کا مرتبہ کم ہوجائے اور انہیں اپنے کنٹرول میں رکھاجائے اور دارالسلطنت سے منتشر کیا جائے۔ اس طرح بادشاہ نے ان میں سے اکثر کو دہلی سے نکال کر کسی اور جگہ رہنے پر مجبور کردیا۔

بادشاہ کی اس پالیسی کا یہ اثر ہوا کہ دہلی میں ان صوفیوں اور شیخوں کا زور کم ہوگیا کیونکہ ان میں سے اکثر دور دراز علاقوں میں چلے گئے اور جو رہ گئے وہ مکمل طور بادشاہ کے وفاداروں میں شامل ہوگئے اور ملک میں تصوف کے بجائے شریعت کی حکومت قائم ہوگئی۔ سلطان نے صوفیہ اور مشائخ کی جو مخالفت لی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اپنے شاہی اقتدار کو بڑھانے کے لئے ان کا اثر ورسوخ کم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مورخین کے نزدیک اس کی بڑی وجہ بادشاہ کے اپنے مُعۡتَقَدات یعنی اپنے عقیدے کے عقلی دلائل تھی۔ مورخ برنی جو صوفی اور روحانی معاملات میں اصلاحی طبقے کے خلاف قدامت پسند گروہ کے ترجمان تھے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

اس بادشاہ کو عنفوان شباب یعنی فہم و ادراک کے آغاز میں ہی بد مذہب سعد منتقی جو سلطان مشائخ نظام الدین اولیأ کے رفیق مجلس تھے اور بد اعتقاد شاعر عبید کے ساتھ صحبت رہی اور مولانا علم الدین فلسفہ کے بڑے عالم بھی بادشاہ کے پاس آتے تھے۔ یہ لوگ علم معقولات یعنی حکمت، فلسفہ اور منطق کے علم میں زیادہ یقین رکھتے تھے اور اپنی گفتگو اور مباحثوں کے دوران علم معقولات یعنی عقلی دلائل سے اہل سنت والجماعت کے متعلق بادشاہ کو بے اعتقاد بناتے تھے اور منقولات یعنی نازل کی گئی کتابیں جیسے توریتؔ، انجیل اور قرآن و احادیث نبویؐ جو ایمان کا سرمایہ، اسلام کے ستون، مسلمانوں کا علمی خزانہ اور سرچشمہ نجات ہیں۔ بادشاہ کے دل سے نکالنے کی کوشش کرتے تھے اور جو چیز معقولات یعنی عقلی اور مفتق کے خلاف ہوتی۔ بادشاہ نہ اسے سنتے اور نہ قبول کرتے تھے اگر معقولات کے یہ فلسفے سلطان کے دل کو احاطہ نہ کرلیتے اور منقولاتِ آسمانی یعنی آسمانی کتابوں، قرآن، انجیل اور زبور وغیرہ سے انہیں ذوق وشوق ہوتا تو اپنی گوناگوں خوبیوں اور اوصاف کے علاوہ خدائی اور نبویؐ احکام کے باوجود وہ انبیاءً اور علمأ کے ارشادات کے خلاف بے گناہ مسلمانوں کے قتل کا حکم نہ دیتے لیکن معقولات (عقل علوم کے فلسفے) جو سنگدلی کی غذا ہے نے ان کے دل پر پورا قبضہ کرلیا تھا اور منقولات (وحی کے ذریعے نازل کی گئی کتابیں اور احادیث نبوی) جو ایک مسلمان کی رہنمائی کرتیں اور آخرت کا خوف دلاتیں ان کے دل میں ان حقائق کی کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کا قتل عام ان کا شعار بن چکا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے لاتعداد علما و مشائخ، سعادات و صوفیا اور قلندروں اور سپاہیوں کو جو سزا دی اس کا باعث علم معقولات یعنی عقلی علم کے برے اثرات اور علم منقولات یعنی قرآنی تعلیمات کی کمی تھی۔ (بحوالہ ترجمہ تاریخ فیروز)

بادشاہ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر وقت فلسفوں کی معقولات عقلی علوم (Rationalism) میں صرف کرتے تھے اور علاؤالدین خَلجی کی طرح ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے۔ جس طرح علاؤالدین خلجی، پیغمبری کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اسی طرح ان کو بھی فضول خیالات اکساتے تھے۔ اپنے خیالات کی گنودگی میں انہوں نے ایک باریہاں تک کہہ دیا کہ خلیفہ راشدین نے ایسا کیا کیا کہ ہم نہ کرسکتے ہیں۔ لیکن محفل میں موجود ایک زندہ دل شخص ملک منصورؒ نے جواب دیا کہ وہ پاک لوگ تھے اور ہم پلید ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بادشاہ مشائخ، علما، سعادات اور اہل دین کو قتل کرواتے تھے اور نو مذہب یعنی نئے نئے مذہب میں داخل ہونے والے غلاموں کو اپنے دربار کی زینت بناتے تھے تاکہ انہیں جو کچھ وہ کہیں یہ لوگ انکارنہ کرسکیں۔

صوفیہ علما اورتذکرہ نگاروں پر بڑے بڑے الزام لگاکر کردار کُشی کے باوجود بادشاہ کا ایک روشن پہلو بھی تھا کہ علمائ ان کے تشدد اور ظلم سے محفوظ رہے۔ وہ خود بھی پابند صلوٰۃ تھے اور لوگوں کو بڑی سختی سے نماز پڑھنے کی تاکید کرتے تھے۔ صوفیوں اورپیر فقیروں کی مخالف کاروائیوں میں انہیں خلاف بدعت و تصوف کی ایک مشہور شخصیت شیخ عبدالعزیز جو بادشاہ کی خدمت میں موجود تھے نے تصُوف لی تعلیم سے روکنے میں مدد کی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق

محمد تغلق کی وفات کے بعد امرأ و علمأ کی اکثریت نے غیاث الدین تغلق کے بھتیجے فیروز شاہ تغلق کے سر پر اسلامی سلطنت کا تاج پہنایا۔ ان کے عہد حکومت کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں امن و امان اور خدمت خلق کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ حکومت پر قدم جماتے ہی انہوں نے لوگوں کی بہتری کے لئے کئی اقدام کئے۔ سب سے پہلے انہوں نے ان قیدیوں کو رہا کروایا جنہیں محمد تغلق نے قید کروایا تھا اور جن لوگوں کو انہوں نے قتل کرویا تھا۔ ان کے پس ماندگان یعنی وارثین کو خون بہا (Exgratia) بطور معاوضہ دیا گیا اور سابقہ بادشاہوں کی اراضی اور جائیدادیں واگزار کروائیں اور جن لوگوں نے شرعی

عدالت کے سامنے کسی پراپرٹی (Property) ملکیت پر اپنا حق جتلایا اسے عدالتی شرعی فیصلے کے تحت حقداروں کو واپس کرایا گیا۔

بادشاہ نے رعایا کی بہبودی اور بہتری کے لئے سخت محنت کی انہوں نے نہریں کھودوائیں، مسافروں کی سہولیت کے لئے سرائیں بنوائیں اور علاج معالجہ کے لئے ہسپتال (Hospitals) بنوائے جہاں لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ پل بنوائے اور نئے شہر آباد کروائے جن میں ایک شہر فیروز آباد بادشاہ کے نام پر مشہور ہے۔ انہوں نے سرکاری لگان اور مالیہ یعنی (Income tax) میں تخفیف کی ان کے دور حکومت میں لوگ بہت خوشحال زندگی بسر کرتے تھے جو محمد تغلق کے عہد حکومت میں خودمختار ہوئے تھے انہیں حکومت کی مصلحت پسندی کے پیش نظر وقتی طور واپس لینے کی کوشش نہ کی گئی لوگ اطمینان کی زندگی گزارتے تھے۔ لیکن اچانک ملک میں بدامنی پھیل گئی کیونکہ تیمور کے حملے کی افواہ نے ملک میں افراتفری پھیلادی جس سے حکومت کمزور ہوگئی اور لوگوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

سلطان ناصرالدین محمود تغلق

فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد ان کے دعویداروں میں خانہ جنگی ہوئی اور آخرکار محمود تغلق ہندوستان لی سلطنت پر قابض ہوگئے۔ محمود سلطنت کی ذمہ داریوں کے اہل نہ تھے اس لئے حکومت کا اقتدار کمزور ہوگیا۔ اسی دوران تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور ملک کے رہے سہے اقتدار کو مٹا دیا۔ وہ جہاں کہیں سے گزرے قہر الٰہی کی طرح ٹوٹ پڑے اور وہاں کے علاقوں کو تباہ و برباد کیا اور عام شہریوں کا قتل عام کیا۔ محمود دہلی کی راجدھانی چھوڑ کر گجرات فرار ہوگئے۔

تیمور کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان پر ان کے حملے کا مقصد یہاں کے کفر و شرک کو مٹانا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی اسلامی حکومت کو تباہ کرنا چاہتے تھے اور یہاں کا مال و دولت لوٹ لینا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کا قتل عام کروایا۔ اس حیثیت سے وہ ہلاکو خان اور چنگیز خان سے کچھ کم نہ تھے۔ تیمور کے اس عمل کو ان کا سیاہ کردار مانا جاتا ہے اور ان کی یہ وحشیانہ حرکت ان کی زندگی کا سیاہ پہلو ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا روشن پہلو بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہلاکو خان اور چنگیز خان سے بہتر انسان تھے۔ وہ مسلمانوں کی قدر کرتے تھے اور ان کی سفارش پر لوگوں پر رحم بھی کرتے تھے۔ مثلاً جب دہلی کے شہریوں نے ان کے چند سپاہیوں کو قتل کردیا تو انہوں نے حکم دیا کہ شہریوں کو قید کرکے ہمارے پاس حاضر کردیا جائے تاکہ انہیں مقتول سپاہیوں کے بدلے میں سزائے موت دی جائے لیکن ایک بزرگ شیخ کی سفارش پر انہیں معاف کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل علم کا پاس و لحاظ کرتے تھے اور اہل علم ان کے دربار میں بلا خوف و ہراس مباحثہ کرتے تھے جبکہ یہ چیزیں چنگیز خان اروہلاکو خان کے درباروں میں ناممکن تھیں۔

محمود تغلق کی دہلی واپسی

تیمور کے حملے سے ملک کی علمی اور روحانی زندگی پر گہر اثر پڑا۔ سلطان محمد تغلق کے دور حکومت میں جو علمأ اور مشائخ دہلی چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں چلے گئے تھے ان کو واپس لانے میں تیمور نے کوئی دلچسپی نہ دکھائی اور جب تیمور ہندوستان سے واپس چلے گئے تو محمود تغلق اپنے ملک واپس آگئے اور تخت شاہی پر دوبارہ قابض ہوگئے چونکہ انہوں نے دہلی کو ایک بے جان جسم کی طرح چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے ان کی ہمت نہ ہوئی کہ باہر کے صوبے داروں پر اپنے احکام جاری کردے۔ اس لئے ان کی حکم شاہی دہلی اور اس کے گردنواح تک ہی محدود رہ گئی۔ باقی تمام بڑے بڑے صوبوں میں خود مختار حکمران قابض ہوگئے تھے۔

خاندان سادات کی حکومت

سلطان خضر خان

تغلق خاندان کے آخری بادشاہ محمود تغلق 1413ئ میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد ہندوستان میں سادات خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اس خاندان کے پہلے بادشاہ خضر خان تھے اور اس خاندان نے تقریباً چالیس (40) سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ لیکن اس چالیس سال کے عرصے میں ملک میں کوئی نمایاں ترقی نہ ہوسکی۔ آخرکار لاہور کے صوبیدار بہلول لودھی نے 1451ئ میں حکومت پر قبضہ کرکے سادات خاندان کا خاتمہ کردیا اور اس طرح لودھی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوگیا۔

لودھی خاندان

بہلول لودھی

بہلول لودھی ایک قابل اور ہونہار بادشاہ تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کو مستحکم کرکے اپنے اقتدار کو مضبوط کیا اور اردگرد کے علاقوں کو فتح کرکے ایک شاندار حکومت قائم کی۔ 1472ئ میں انہوں نے جونپور فتح کرکے حکومت کو مزید وسعت اور وقعت دے کر امن و امان قائم کیا۔ ان کی وفات 1489ئ میں ہوئی اور ان کی جگہ سکندر لودھی تخت نشین ہوئے۔

سکندر لودھی

بہلول لودھی کی وفات کے بعد سکندر لودھی ہندوستان کے بادشاہ بن گئے۔ وہ ایک قابل، ذہین اور باصلاحیت بادشاہ تھے۔ انہوں نے آگرہ شہر کی بنیاد ڈال کر اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ انہیں اکثر وقت افغان امرأ اور گوالیار کے ہندو راجاؤں کی لڑائیوں میں گزارنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے علوم و فنون کی طرف بہت دھیان دیا۔ ان کے دور حکومت میں ملتان کے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ تلبسنی اور شیخ عزیزاللہ ہندوستان تشریف لائے جنہوں نے درس و تدریس سے علم و ادب کی شان بڑھادی۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ساری خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود ایک سخت مزاج آدمی تھے۔ جب کسی مسئلے پر مختلف رائیں ہوتیں تو وہ سخت رائے اختیار کرلیتے جب وہ ایک

علاقے کے گورنر تھے تو انہیں جب خبر ملی کہ کوروکھیشتر کی جگہ بہت سارے ہندو جمع ہیں جنہوں نے تالاب میں نہانے اور مندر میں پرستش کرنے کے لئے ہنگامہ مچا رکھا ہے تو انہوں نے فوراً حکم دیا کہ انہیں تہہ تیغ کرکے مندر کو مسمار کیا جائے۔ لیکن ملک العلما عبداللہ مشیر کے مشورے کے بعد انہوں نے اپنا حکم التوا میں رکھا۔ ان کی حکومت کے دوران ایک برہمن کے قتل ہونے کا ایک اور معاملہ پیش آیا۔ جب بدھنؔ نامی ایک برہمن کا قتل ہوا جس نے ہندو مذہب اور اسلام دونوں کو سچا ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور اس قتل پر علمائ میں اختلاف رائے تھا۔ لیکن آخر میں قاضیوں کی روایت کے مطابق مقتول کے قتل کو اس لئے جائز قرار دیا گیا کہ وہ مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہوگئے تھے۔ اس لئے ان کا قتل شرعی اعتبار سے جائز تھا۔

سکندر لودھی مذہبی جوش و خروش رکھنے والے کٹر مسلمان تھے۔ لیکن اس زمانے میں ہندوستان کی اسلامی حکومت ایک سخت اور مشکل دور سے گزر رہی تھی۔ اس لئے نظام سلطنت میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہورہی تھیں۔ لیکن ان حالات کے باوجود بادشاہ نے علم و ادب کی ترویج و تشہیر پر خاص توجہ دی اور ملک میں امن و امان قائم کردیا۔ ان کے عہد حکومت کی ایک دلچسپ تصنیف طِب سکندری ہے۔ جس میں ایک ہزار ایک سو سات 1107 ، امراض اور ان کے ادویات کا ذکر ہے۔یہ کتاب آج بھی ہندوستان کے طبی علوم میں ایک بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ سلطان کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے چند شعر بھی کہے ہیں اور ان کا شاعرانہ تخلص گلَرخی تھا۔ شیخ جمالی ایک مشہور شاعر ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ بادشاہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔

ابراہیم لودھی

سکندر لودھی کے انتقال کے بعد ابراہیم لودھی ہندوستان کے بادشاہ بن گئے۔ انہیں سکندر لودھی کے دور حکومت کے مشہور شاعر اور قصیدہ گو شیخ جمالی سے اختلاف تھا کیونکہ انہوں نے شروع میں بادشاہ کی تنقید کی لیکن بعد میں وہ بادشاہ کے حامی بن گئے اور ان کے بارے میں قصیدے لکھنے شروع کردیئے۔ ابراہیم لودھی کو بابرؔ نے شکست دے دی اور ہندوستان پر ان کی حکومت قائم ہوگئی اور اس طرح ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا دور شروع ہوگیا۔

مغلیہ حکومت کی ابتدا

ظہیر الدین بابر

مغلیہ خاندان کی حکومت کی بنیاد سلطان ظہیرؔالدین بابر نے ڈالی۔ وہ تیمور کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ گیارہ (11) سال کی عمر میں انہیں ترکستان کی تخت نشینی نصیب ہوئی۔ لیکن تخت نشین ہوتے ہی انہیں زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار طویل کشمکش کے بعد انہیں اپنا موروثی وطن چھوڑنا پڑا۔ وطن چھوڑ کر انہوں نے قابل میں اپنی حکومت قائم کردی اور بعد میں ہندوستان کے تخت نشین بادشاہ ابراہیم لودھی کی حکومت سے نالان اور پریشان امیروں اور وزیروں کی دعوت پر ہندوستان آئے۔ 1526ئ میں پانی پت کی لڑائی میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی کی حکومت پر قابض ہوگئے۔ اگرچہ انہوں نے دہلی کو فتح کردیا لیکن دہلی کی فتح سے پورا ہندوستان فتح نہ ہوا کیونکہ مرکزی حکومت کی کمزوری سے ہر طرف کے صوبیدار خود مختار ہوگئے تھے۔ شمالی ہندوستان میں رانا سانگا نے اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ 1529ئ میں بابر کو ان سے ایک بڑا معرکہ ہوا۔ رانا سانگا کو بہت سارے ہندو راجاوؤں نے ساتھ دیا چونکہ ان کے پاس ایک بڑی تعداد کی فوج تھی۔ اس لئے بابرؔ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ بڑے بڑے قلعے مَعتمد یعنی قابل اعتماد سرداروں کے سپرد کرکے پنجاب لوٹ جائیں اور حالات سدھر جانے کا انتظار کریں لیکن بادشاہ نے پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا کہ مسلمان ہم پر طعنہ دے کر کہیں گے کہ ہم زندگی کو عزیز سمجھ کر ایک بڑی سلطنت سے ہاتھ دھوبیٹھے۔ جوانمردی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم شہادت کے لئے تیار ہوکر جان فشانی سے لڑیں۔ بادشاہ کی اس تقریر نے لوگوں کے دلوں کو جذبہ شہادت سے اس طرح محصَور ومحضوظ کیا کہ سب نے الجہاد الجہاد کا نعرہ لگایا اور وعدہ کیا کہ ہم میدان جنگ سے فرار نہیں ہوجائیں گے۔ ان کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا کہ شہید ہوئے تو جنت میں جائیں گے کامیاب ہوئے تو غازی بن کر پوری دنیا پر چھا جائیں گے اور اسلام کی روشنی پھیلائیں گے۔

بابرؔ نے گناہوں سے توبہ کرکے بارگاہ الٰہی میں دعا کی اور میدان جنگ میں اتر آئے۔ دن بھر جنگ جاری رہی راجپوت جانتے تھے کہ اس لڑائی سے شمالی ہند کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس لئے وہ جان جوکھم میں ڈال کر لڑائی میں کود پڑے۔ لیکن فتح مسلمانوں کی ہوئی۔ اس جنگ کی جیت کے بعد بابر نے غازی کا لقب پایا۔ رانا سانگا کو شکست فاش دینے کے بعد بابر نے چندیریؔ کو فتح کرکے اسے احمد شاہ ناصر الدین کے سپرد کیا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ چندیریؔ، سارنگپور، نتھوراؔ اور دیگر بڑے بڑے شہروں کی مسجدوں اور خانقاہوں کو رانا سانگا کے حکم سے حیوانات کا مسکن بنایا گیا اور ان کی دیواروں کو گوبر سے لپوایا گیا تو انہوں نے مسجدوں کو اس غلاظت سے صاف کرواکے اذان شروع کردی اور اس طرح مسجدوں میں پھر سے اذانوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

بابرؔ نہ صرف ایک بہادر سپاہ سالار تھے بلکہ وہ فارسی زبان کے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کتاب تزک بابری ایک بے نظیر کتاب ہے جس میں لفاظی اور سَنی سَنائی باتوں کے بجائے آنکھوں دیکھی اور مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کا بیان ہے۔ اس میں مناظر قدرت کی دلچسپی کے علاوہ ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے متعلق معزز اور دلچسپ باتیں مذکور ہیں۔ تزک بابری کے علاوہ انہوں نے اپنے رسم الخط خط بابری میں قرآن مجید کے کئی نسخے تحریر کرکے مکہ معظمہ بھجوادیئے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مدبر اور ذہین شخصیتوں میں شامل ہیں۔ اس کا اندازہ اس خط سے کیا جاتا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے ہمایوں کے نام ارسال کیا تھا۔ خط کا ترجمہ یہ ہے: ''فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ آپ ملک کے بادشاہ بن گئے۔ اپنی بادشاہی میں آپ کو مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے:

۱۔ آپ مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دیں۔ مذہبی رسومات کا خیال رکھتے ہوئے رَو رعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کریں۔

۲۔ گاؤ کشی سے بالخصوص پرہیز کریں تاکہ لوگوں کے دل میں آپ جگہ پائیں اور اس طرح وہ آپ کے احسان مند بن کر آپ کے فرمانبردار بن جائیں گے۔

۳۔ آپ کو کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے اور ان کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

۴۔ اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کے بجائے لطف و احسان سے کریں وار شیعہ و سَنی اختلافات کو نظرانداز کریں تاکہ اسلام مضبوط ہوجائے اور ملک میں امن و امان قائم رہے۔‘‘

ہمایوں کی تخت نشینی

بابر نے 1530ئ میں وفات پائی ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ہمایوں تخت نشین ہوئے۔ وہ تیس (30) سال کے بہت نرم دل اور نرم مزاج نوجوان تھے۔ شیر شاہ سوری نے انہیں چند سال حکومت کرنے کے بعد 1540ئ میں شکست دے کر ایران بھگا دیا اور ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کردی۔

شیر شاہ سوری کی حکومت

شیر شاہ نے پانچ سال تک دہلی پر حکومت کی وہ ایک غیر معمولی بردبار اور نرم مزاج آدمی تھے۔ انہوں نے مدرسوں سے قرآنی تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے علاوہ فلسفہ کے علوم سے بھی واقف تھے۔ وہ گزشتہ سلاطین کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے شوقین تھے اور علمائ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ علم و ادب سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ وہ بڑے قابل حکمران تھے۔ اپنی قابلیت کی بنیاد پر ہی وہ ایک معمولی جاگیردار کے عہدے سے ترقی کرکے ہندوستان کے بادشاہ بن گئے۔ انہیں حکمرانی کے لئے صرف پانچ سال کی مدت نصیب ہوئی۔ اس مختصر مدت میں انہیں لڑائیوں میں وقت گزارنا پڑا لیکن پھر بھی انہوں نے سلطنت کے انتظام میں نمایاں اصلاحات کیں جنہیں بعد میں اکبر اور اورنگ زیب نے وسعت دے کر ملک کو خوشحال بنایا۔تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ بڑے ہوشیار اور ہونہار بادشاہ تھے۔ اگر اسے موت مہلت دیتی تو شاید ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت موجودہ حالات سے زیادہ بہتر ہوتی۔ 1945ئ میں ایک علاقے کے محاصرے کے دوران آپ شہید ہوگئے اور ان کی جگہ اسلام شاہ سوری تخت نشین ہوئے اور ان کی حکومت کا مختصر زمانہ بھی لڑائیوں میں گزرا۔یہاں تک کہ انہوں نے 1954ئ میں وفات پائی۔ اس کے بعد ہمایوں نے ایران سے واپس آکر 1550ئ میں دہلی پر دوبارہ قبضہ کیا۔

ہمایوں کی دہلی واپسی

ہمایوں نے 1540ئ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھائی اور دہلی سے فرار ہو کر سندھ کے ریگستانوں میں پریشان حال رہے۔ اسی دوران ان کے بیٹے اکبر پیدا ہوئے جب وہ ہندوستان سے مایوس ہوئے تو انہوں نے ایران کا رُخ کیا۔ ایران کے بادشاہ نے انہیں خوش خلقی سے استقبال کیا اور کچھ مدت کے بعد جب انہوں نے ہندوستان واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو شاہ ایران نے انہیں ایک چھوٹی لشکر کے ساتھ ہندوستان واپس روانہ کیا۔ لیکن انہوں نے ہندوستان آنے سے پہلے 1545ئ میں قابل اور قندہار کا رخ کیا اور ان علاقوں کو فتح کر کے 1550ئ میں ہندوستان تشریف لے آئے اور دہلی اور آگرہ پر قابض ہو گئے۔ لیکن اپنی حکومت کو وہ ابھی مستحکم نہ کر پائے تھے کہ اپنے کُتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر وفات پا گئے اور حکومت کی ذمہ داری ان کے کم سن بیٹے اکبرؔ نے اپنے اتالیق استاد کی حمایت سے سنبھال لی۔ انہوں نے شیر شاہ سوری کے خاندان کا خاتمہ کر کے دوبارہ مغل حکومت قائم کر دی۔

جلال الدین اکبر کا دور حکومت

مغل خاندان کی بنیاد شگفتہ مزاج، خوش مزاج بادشاہ بابرؔ نے رکھی تھی۔ انہیں اصل محبت ترکستان اور افغانستان سے تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت ان ہی ممالک میں گزارا اور اپنی آخری عمر میں ہندوستان کا رُخ کیا اور چار سال حکومت کرنے کے بعد 1530ئ میں انہوں اس دنیائے فانی سے وفات پائی۔ ان کے انتقال کے دس سال بعد ان کے بیٹے ہمایوں جسے شیر شاہ سوری نے ملک بدر کیا تھا نے دوبارہ ہندوستان کو فتح کرکے اپنی حکومت کا اعلان کردیا۔ لیکن چند مہینوں کے بعد ہی جب کہ ابھی ملک میں سوری خاندان کی افراتفری موجود تھی ہمایوں اتفاقی حادثے کا شکار ہوگئے اور حکومت کا بارگراں ان کے تیرہ (13) سالہ بیٹے اکبر کے کندھوں پر آن پڑا۔ اکبر 1556ئ میں تخت نشین ہوئے اور ان کی تخت نشینی میں اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان سے پہلے ہندوستان میں سب سے زیادہ جاہ و جلال والے بادشاہ سلطان علاؤالدین خلجی گزرے۔ لیکن خلجی دور صرف پنتالیس (45) سال تک رہا۔ اس کے بعد خاندان غلامان کی حکومت آئی جو تقریباً سو سال تک رہی اور پھر سادات خاندان نے صرف اڑتالیس سال کی حکومت کی اور اس کے بعد لودھی خاندان کی حکومت آئی جو صرف پندرہ (15) سال رہی۔ اس طرح ایک خاندان کی حکومت ابھی پاؤں جمانے کی کوشش میں ہوتی تھی تو دوسرے خاندان کی حکومت قائم ہوجاتی تھی۔ اس لئے کسی بھی حکومت کو حالات سمجھنے اور مکمل اصول و قوانین جاری کرنے کا موقعہ نہ ملتا تھا جس کی وجہ سے سارا سلسلہ درہم برہم ہوجاتا۔یہی وجہ ہے کہ ابتدائی مسلمان خاندانوں کی حکومت نہایت سطحی ہوتی تھی اور مرکزی نظم و نسق کے بغیر باقی اختیار ہندو پنچایتوں کے پاس ہوتا تھا۔ اس کشمکش کے تناظر میں دو صدیوں تک حکومت ترقی کے بجائے تنزل کی شکار ہوئی تھی اور ہندو مذہب کا احیائ اور اعتبار بڑھ رہا تھا۔ ہندو راجاوؤں نے بڑا اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ اگرچہ بابرؔ اور شیر شاہ سوری نے ہندوستان کی حکومت کو پورا استحکام اکبر کے ذریعے سے حاصل ہوا۔ اس استحکام کی ضمن میں اکبر نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ انہوں نے ہندوستان کے ان صوبوں کو اپنی حکومت میں شامل کردیا جو کافی عرصے سے آزاد اور خودمختار تھے۔ 1556ئ میں بابر کی وفات کے بعد اکبر کی کم عمری کی وجہ سے بابر کے وزیر بیرمؔ خان نے اکبر کے نام پر ہندوستان کا تخت حکومت سنبھالا اور پھر چار سال بعد 1560ئ میں اکبر نے بیرمؔ خان کو معزول کرکے حکومت کا اقتدار خود سنبھالا۔

اکبر کے فتوحات

اکبر نے حکومت سنبھالتے ہی اسے مستحکم کرنا شروع کردیا۔ 1561ئ میں مالوہؔ کو فتح کیا اور 1564ئ میں گونڈوانہ کو اپنی سلطنت میں شامل کردیا۔ اس کے بعد جے پور کے راجہ بہاری مل نے اکبر سے مصالحت کی اور اپنی بیٹی کو ان کی بیاہی میں دی۔ اس کے بعد اکبر نے راجہ بہاری مل کے بیٹے بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو اعلیٰ منصبوں پر فائز کیا۔ اس کے بعد بہت سے راجاؤں نے ان کی اطاعت قبول کی اور گجرات اور بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔ یہ فتوحات اکبر کے پہلے دور کے فتوحات تھے۔ دوسرے دور میں انہوں نے کشمیر کو جو کبھی بھی ہندوؤں کے قبضے میں نہیں آیا تھا فتح کیا۔ اس کے بعد 1591ئ میں سندھ اور بلوچستان اور قندہار فتح ہوئے اور پھر دکن، احمدنگر اور اسیر گڑھ کے علاقے فتح ہوئے۔ اس کے بعد اکبر 1601ئ میں آگرہ واپس آئے اور چار سال حکومت کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اکبر کا نظام حکومت

اکبر نے مسلسل فتوحات کرکے تاریخ ہند میں ایک خاص درجہ حاصل کیا۔ حقیقت میں ملک گیری آسان ہے لیکن ملک کی حکومت کرنا مشکل ہے۔ اکبر نے نہ صرف ملک گیری کی بلکہ وہ ملک کے نظام حکومت میں بھی کامیاب رہے۔ حالانکہ بعد میں اورنگ زیب عالمگیر نے اس سیکولر (Secular) اور باطل نظام کو مسترد کرکے اسلامی نظام قائم کردیا۔

اکبر کے نظم و نسق اور فتوحات کا دارومدار ان کے امرائ کی قابلیت، فرض شناسی اور وفاداری پر تھا۔ اکبر کے مشیر ابوالفضل کے کہنے کے مطابق اکبر کے نظام حکومت کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سلطنت کے دور دراز صوبوں پر ان کی مکمل گرفت ہوتی تھی اور انھوں نے منصب داری کا ایک اعلیٰ نظام قائم کیا تھا اور ان منصب داروں کو ان کی اچھی کارکردگی پر ترقی (Promotion) ملتی تھی۔ انہیں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں تبدیل کیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے فرائض میں من مانی نہ کریں۔ اکبر کا ایک بڑا کارنامہ زمین کا بندوبست تھا۔ جس میں زمینداروں سے زمین کا معاملہ یعنی لگان وصول کیا جاتا تھا۔ جو معمولی ترمیمات کے ساتھ اب تک ملک میں رائج ہے۔ اس بندوبست کے لئے انھوں نے تجربہ کار اور سمجھدار اشخاص ٹوڈرمل اور میر فتح اللہ شیرازی کو کام پر لگایا تھا۔ اکبر کے زمانے میں علوم و فنون نے بھی بہت ترقی کی تھی جس سے حکومت کی شان بڑھ گئی تھی۔ شعر و شاعری اور علم و ادب کو بھی عروج ملا تھا اور شاعروں اور ادیبوں کی قدر کی جاتی تھی۔ مَلِکَ الشّعرا (شاعروں کا بادشاہ) کا عہدہ پہلی مرتبہ اکبرؔ کے زمانے میں ہی قائم ہوا۔ آئین اکبری میں ابوالفضل کی تصنیف کردہ اخلاق، تاریخ، تصوف اور ادب کی مشہور کتابیں موجود تھیں جنہیں اکبر پڑھوا کر سنتے تھے۔ اس کے علاوہ کیمائے سعادت، گلستان بوستان، قابوس نامہ، شاہ نامہ، مصنوی مولانا رومی کے علاوہ ملاجامی اور امیر خسرو کی تصنیفات بھی موجود تھیں جو اکبر کے سامنے پڑھی جاتی تھیں۔ اکبر نے نہ صرف علوم وفنون کی سرپرستی کی بلکہ صنعت و حرفت کو ترقی دینے میں بھی پوری کوشش کی۔ انھوں نے ایران اور کشمیر سے کاریگر بلوائے اور شال بافی، قالین سازی اور دیگر ملبوسات کے کارخانے قائم کردیئے اور عہدداروں کو حکم دیا کہ وہ یہاں کے بنے ہوئے کپڑے پہن لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں بہت ساری صنعتیں قائم ہوئیں جو آج تک پورے ہندوستان میں جاری ہیں۔

اکبر کی صَلحِ کُل کی پالیسی

صَلحِ کل سے مراد ایک ایسا نظریہ جس کے تحت تمام انسانوں کے ساتھ مذہب، نسل یا فرقے کی بلا امتیاز امن، رواداری، برداشت اور آپسی ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزارنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس میں اختلاف کے باوجود تصادم کے بجائے مفاہمت اور بقائے باہمی کو اہمیت دی جاتی ہے۔

اگرچہ اکبر ملک گیری اور ملک رانی یعنی ملک فتح کرنے اور ملک کا انتظام چلانے میں بے مثال تھے اور جس طرح انہوں نے ہندوستان کی حکومت کو مستحکم کیا کسی اور ہندوستانی بادشاہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اپنے صحیح دائرہ عمل سے نکل کر مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی اور درباریوں کی خوش آمد میں آکر فضول اور خلاف شریعت کام کئے جس سے ملکی فتوحات اور سیاسی احسانات فراموش ہوگئے۔ کیونکہ ان بے ہودہ کاموں سے کوئی ذی شعور مسلمان خوش نہ تھا۔

اکبر کی مذہبی پالیسی کے دو پہلو تھے۔ ایک پہلو میں انتظامی اور سیاسی معاملات میں صَلح کل کی پالیسی تھی اور دوسرے پہلو میں شاہی دربار کے مشیروں اور وزیروں کو خوش کرنے کے لئے دین الٰہی کی پالیسی تھی۔ جسے ابوالفضل نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے رہنمائی کا آئین قرار دیا تھا۔ صَلح کَل کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اکبر نے 1564ئ میں ایک راجپوت شہزادی سے شادی کرلی اور پھر بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ جیسے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر فائض کیا اور ہندوؤں پر لگایا گیا ٹیکس (Tax) معاف کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو نظام حکومت میں جو اہمیت تھی وہ کم ہوگئی اور ان پر ہندوؤں کا غلبہ ہوگیا کیونکہ انہیں حکومت میں مداخلت کرنے کی آزادی حاصل ہوگئی۔

حکومت کے ابتدائی دور میں اکبر بادشاہ دل و جان سے مذہب کی پابندی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے باپ کی جلاوطنی میں مشکلات کا سامنا کیا تھا اور زندگی کے سرد و گرم حالات بھی دیکھے تھے۔ ان حالات سے ان کی طبعیت میں سوزو گداز اور روحانی رنگ پیدا ہوگیا تھا۔ اس لئے جب وہ تیرہ (13) برس کی چھوٹی عمر میں تخت نشین ہوئے تو ان کی گردن خودبخود رب کائنات کے سامنے سجدہ شکر میں جھک جاتی تھی اور شیرشاہ سوری نے علمائ اور دانشوروں کو جو عزت اور آبرو دے رکھی تھی انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ جابجا قاضیوں اور مفتیوں کو اشاعت اسلام کا کام سپرد کرکے ان کی قدرومنزلت بڑھادی۔ اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کو دینی تعلیم سے آراستہ کروایا اور اکبر خود مسجد میں اذان دیتے تھے اور اپنے ہاتھ سے مسجد میں جھاڑو دیتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے مذہبی رجحان میں اس حد تک تبدیلی آئی کہ ایک دن وہ جشن سالگرہ کی تقریب میں زعفرانی لباس پہن کر آئے جس پر ایک عالم

دین شیخ عبدالنبی نے بہت مذمت کی۔ یہاں تک انہیں اپنا عصا دیکھا کر ٹوکا اور اپنا مذہب اور شریعت یاد دلائی۔

اکبر دینی مجالس تو منعقد کرتے تھے جن میں ملک بھر کے علمائ آتے تھے لیکن ان مجالس میں زیادہ علم دین کی توضیح کے بجائے ان کی بڑھائی کی نمائش اور دوسروں کی تضحیک و توہین ہوتی تھی۔ ان مجالس میں ہر کوئی اپنی سربلندی دکھانے کی کوشش کرتا تھا اور اس طرح ایک دوسرے کی تذلیل و تکفیر ہوتی تھی۔یہ علمائ مسائل پر اس طرح بحث کرکے اختلاف کرتے تھے کہ بادشاہ حیران رہ جاتا کیونکہ ایک عالم ایک چیز کو حرام کہتا تھا تو دوسرا اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دیتا۔ اس طرح بادشاہ دونوں سے بدظن ہوجاتا یہاں تک کہ حلال و حرام کی تمیز ہی ان کے دماغ سے خارج ہوگئی۔ ان بحث و مباحثوں کے دوران بیویوں کی تعداد پر بھی بحث ہوتی جس میں کہا گیا کہ چار سے زائید بیویاں رکھنا اسلام میں جائز نہیں ہے چونکہ بادشاہ کے نکاح میں چار سے زائید بیویاں تھیں اور وہ کسی بیوی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا اسے خیال آیا کہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لیا جائے تاکہ کسی بیوی کو رخصت کئے بغیر شرع کی پابندی لی جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ چار سے زائید بیویوں کو مَتعہ یعنی عارضی نکاح کا فتویٰ لے کر رکھا جائے۔ لیکن علمائ حق نے فتویٰ دیا کہ چار سے زائید بیویوں کو طلاق دے کر صرف چار بیویوں پر اکتفا لیا جائے۔ لیکن بادشاہ نے حنفی قاضیوں کو رخصت کرکے ایک ایسے قاضی کو تعینات کیا جنہوں نے بیویوں کی شرعی تعداد کے بارے میں حکمتاً خاموشی اختیار کی۔

ئ میں ایک نازک واقعہ پیش آیا جس میں علمائ کو ایک نازک صورت حال سے گزارنا پڑا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ متھرا کے ایک قاضی صاحب نے مسجد بنانے کے لئے مثالہ(Material) جمع کیا لیکن ایک مقامی برہمن نے اس مثالے پر قبضہ کرکے اسے مندر بنوانے میں استعمال کیا۔ جب قاضی نے اس ہندو کو اس غلط حرکت سے روکا تو اس نے اہل اسلام کو گالیاں دیں۔ اس پر برہمن کے ایک اپنے آدمی نے گواہی دی کہ برہمن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دے کر بے ادبی کی۔ اس پر علمائ کی مجلس منعقد ہوئی جس میں بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ ہندو برہمن نے جان بوجھ کر دین اسلام کی تذلیل کی۔ اس لئے اسے شرعی سزا دی جائے۔ بادشاہ کے راجپوت ہندو بیوی نے مجرم کی رہائی کا مطالبہ کیا لیکن اس مطالبے کے باوجود مجرم کو سزائے موت دی گئی۔

ہندو مجرم کی سزائے موت کے بعد ہندوؤں نے بادشاہ سے شکایت کی تو بادشاہ نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنے دربار میں مسلمان علمائ اور قاضیوں کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے برہمنوں اور بھکشوں کو شامل کردیا یہاں تک کہ پادری اور سادھو بھی شریک دربار ہوئے اور یہ غیر مسلم درباری اسلام اور بانی اسلام کے خلاف نہایت ناگوار باتیں کرتے تھے۔ اس طرح ملک میں دربار کے غیر مسلموں کے نئے رنگ سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیل گئی کیونکہ اب دربار میں مسلم عالموں اور ہندو بھکشوؤں کے ملے جلے مباحثے ہوتے تھے اور بادشاہ ان بحث مباحثوں سے بدظن ہوکر اسلام کے دائرے سے نکل گئے اور دین الٰہی کے نام سے اپنا نیا دین قائم کردیا۔

اسی دوران شیعہ مسلک کے عالم اور قاضی القضا ملا محمد یزدی نے علی اعلان بادشاہ کے خلاف فتویٰ دیا کہ بادشاہ بے دین ہوگئے ہیں۔ اس پر جہاد واجب ہے۔ دربار کے عالموں اور مفتیوں نے بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے ان بے دین خیالات سے واپس آئیں لیکن انہوں نے کسی کی نہ سَنی بلکہ بگڑ کر عالموں کو برا بھلا کہا اور قاضی القضا اور دیگر علما کو کوئی نہ کوئی بہانہ بناکر جیل بھجوادیا اور ان علما اور قاضیوں کو بھی جیل خانوں میں بند کروایا جنہوں نے مَتعہ عارضی نکاح اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو خلاف شرع اور غیر اسلامی قرار دیا تھا اور اس طرح اپنے قائم کردہ دین الٰہی اور آئین اکبریؔ کو نافذ کرنے کا راستہ ہموار کیا۔ اپنے دین پسند مخالفوں کو شہید اور قید کروانے کے علاوہ انہوں نے پنجاب کے راسخ العقیدہ اور با اثر علما کو ان کے امیر مخدومؔ الملک سمیت ملک کے مختلف حصُوں میں منتشر کردیا تاکہ انہیں بادشاہ کی تنقید کرنے کا موقعہ نہ مل سکے۔

جو لوگ اکبر کی بد اعتقادی اور دینی بے راہ روی (Religious anarchy) سے نالاں تھے انہوں نے کوشش کی کہ اکبر کو تخت سے برطرف کرکے ان کی جگہ ان کے بھائی مرزا محمد حکیم جو اس وقت قابل کے حکمران تھے ہندوستان لاکر بادشاہ بنائیں۔ لیکن وہ اس پلان میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس طرح اکبر نے علمی بغاوت کا خاتمہ تو کردیا لیکن علما کے دینی بحث و مباحثوں میں ان کے خلاف ناراضگی برقرار تھی۔

اکبر پر بے دینی کے الزامات اور ان کی مخالفت

اکبر کو طرح طرح کے بے دینی کے الزامات لگائے گئے۔ انہیں کیش برہمن یعنی برہمن عقیدے سے تعلق رکھنے کا طعنہ دیا گیا اور اُلوہیت یعنی خدائی شان رکھنے کا طعنہ دیا گیا۔ انہیں حلول کا الزام بھی لگایا گیا۔ حلول کا معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں اس طرح داخل ہونا کہ دونوں میں تمیز نہ ہوسکے۔ احمد قادیانی نے خدا کی ذات میں حَلول کا دعویٰ کیا یعنی ان کے کہنے کے مطابق نعوذ باللہ خدا کی ذات ان کی ذات میں داخل ہوگئی اور پھر ان میں خدائی صفات پیدا ہوگئے۔ اس طرح انہوں نے پیغمبر ہونے کے بجائے ذات باری تعالیٰ ہونے کا دعویٰ کیا جسے اَس وقت کے علما نے رد کردیا اور ان کی پیروی کرنے والوں کو جہنم سے بچالیا۔ اس طرح بادشاہ کو کئی گمراہ لوگوں نے مظہر حق یعنی حق کو ظاہر کرنے والا قرار دیا اور بادشاہ نے صُلحِ کُل کے احترام میں ان پریشان مغز لوگوں کی ذرہ برابر سرزنش نہ کی۔ اس لئے وہ بے سمجھ، بد مزاج اور بد خواہ مشیر اور وزیر غلطیوں میں بتلا ہوگئے اور ان کی کذب بیانی اور افترا پردازی اور بہتان تراشی کو عام شہرت ملی۔ بادشاہ کی دوسری مخالفت ان کے دعوٰئے پیغمبری پر تھی کہ انہوں نے شریعت اسلامی کو چھوڑ کر آئین اکبری کے نام سے نیا آئین وضع کیا۔ بعض لوگوں نے ان کو شیعہ ہونے کا الزام لگایا کیونکہ جب بادشاہ کے دربار میں شیعہ سنی کے نظریہ کو پیش کیا جاتا تو بادشاہ اکثر شیعوں کے نظریئے کو اہمیت دیتے تھے اور بعض لوگوں نے کیش برہمن (یعنی برہمن عقیدے سے تعلق رکھنے) کا الزام لگایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ دانشمند برہمنوں سے حکومت کے بارے میں مشاورت کرتے تھے اور اکثر ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں پر لگادیا تھا اور اس کے علاوہ ہندو عورتوں سے نکاح کئے تھے۔ ترکستان کے گورنر عبداللہ خان نے اکبر کو ایک خط لکھا کہ آپ کی نسبت پیغمبری اور خدائی دعویٰ سنتے ہیں۔ اس کے جواب میں اکبر نے کہا کہ بعض علما قرآن مجید کی غلط ترجمانی کرتے تھے تو میں نے ان کو اپنے دربار سے خارج کردیا۔ اس لئے انہوں نے خفا ہوکر میرے متعلق غلط افواہیں پھیلا دیں اور میرے نسبت نبوت اور الوہیت یعنی نبی اور خدا ہونے کے دعوے منسوب کئے۔

مورخ بدایونی نے اکبر کے متعلق کہا کہ اکبر مسلمان نہ رہے تھے بلکہ وہ اسلام کے سخت دشمن ہوگئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے حکم دیا تھا کہ نئی مسجدیں تعمیر نہ کی جائیں اور پرانی مسجدوں کی مرمت نہ کی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی حکومت کے آخری ایام میں لاہور شہر میں کوئی مسجد نہ رہی تھی اور کئی مسجدوں کو اصطبل یعنی گھوڑوں کو باندھنے کی جگہ بنایا گیا تھا۔ یہ بھی الزام ہے کہ اکبر نے عیسائی مذہب قبول کرنے کے لئے اپنی ایک بیوی کے علاوہ سب بیویوں کو درباریوں میں تقسیم کردیا اور عیسائیوں سے وعدہ کیا کہ میں عیسائی بن جاؤں گا۔ بدایون کے یہ الزامات کس حدتک صحیح ہیں اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اکبر کے حامی علما کا کہنا ہے کہ یہ سب غلط ہے۔ اگر اس میں کوئی سچائی ہوتی تو سلطنت کے آئین میں اس کا تذکرہ ہوتا اور کوئی نہ کوئی مورخ اس حقیقت کو بیان کرتا۔ یہ دراصل بادشاہ کے تئیں بدایونی کے اظہار خیالات ہیں اور ان خیالات کو بدایونی کے پیروکار اس طرح پیش کرتے ہیں کہ باقی احکامات پر شک و شبہ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً اکبر تعلیم کے طریقے میں اصلاح کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے ناقدین تنقید کرنے والے اسے اسلام سے عدم دلچسپی اور اسلام دشمنی سمجھتے تھے اور بدایونی کے متعلق کہتے ہیں کہ انہوں نے اکبر کے متعلق واقعات توڑ مروڑ کرپیش کئے اور ان کے خلاف ایسی باتیں کہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر ملحد ہوچکا ہے۔ انہوں نے بے راہ روی کی ساری منزلیں طے کرچکی تھیں۔ گاؤ کشی بند ہوچکی تھی۔ ریش تراشی اور ریش کا صفایا (Clean Shave) عام ہوچکا تھا اور بعض دیندار لوگ بادشاہ کے ترک دین کی خوشامد (Flattery) کرتے تھے۔ جس میں یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ بادشاہ نبوت اور الوہیت یعنی نبی او رللہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن اکبر کے حامی اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ انہوں نے مسجدوں کو مسمار کیا یا کسی مسجد کو گھوڑے کے اصطبل میں تبدیل کیا بلکہ انہوں نے نئی مسجدیں تعمیر کروائیں اور قلعہ شاہی میں بھی ایک نئی مسجد بنوائی اس طرح سے ان کی حکومت سیاسی اور دینی پالیسی کے متضاد بیانات سے رنگی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات واضح معلوم ہوتی ہے کہ ان کی حکومت کی پالیسی لادین سیاست (Secularism) پر مبنی اور منحصر تھی۔

اکبر کے عمومی یعنی عام احکامات

اکبر کی حکومت میں مذہب کے مروجہ اسلامی طریقہ عبادت اور خواتین میں جو تبدیلی آئی اس میں اکبر کے ہندو مشیروں کے علاوہ وہ مسلمان علما بھی شامل ہیں۔ جو انہیں خوش کرنے کے لئے اسلامی قوانین اور عبادات میں تبدیلی لانے کو ناگوار نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے لادین حکومت قائم کرنے میں اکبر کی مدد کی۔ یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات بعض پیر اور مرشد جیسا کہ آج بھی مسلمانوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے اپنے مریدوں کو کچھ وقت کے لئے یا ہمیشہ کے لئے گوشت کھانا ترک کرنے کے لئے یا اس طرح کے دوسرے غیر شرعی احکام دے دیتے ہیں اور طریق بیعت اور اظہار عقیدت کے مختلف آئین بنالیتے ہیں اور ان اعمال کو اسلام سے باہر نہیں سمجھتے ہیں۔ اکبر کے دور حکومت میں اس طرح کے معاملات میں بہت آزادی تھی۔ ایک مسلمان بادشاہ کے ملک کی حکومت میں اس طرح کے احکام و آئین اگرچہ قابل اعتراض اور ضعف اسلام کے ذریعے ہیں لیکن وہ ایک مختصر طبقے کے لئے تھے۔ اس لئے ان پر زیادہ دھیان نہ دی جاتی تھی۔ لیکن اکبر کے خلاف سب سے بڑا اور وزن دار اعتراض یہ تھا کہ انہوں نے اس طرح کے احکام کو اپنے مریدوں اور اپنی مخلوق تک ہی محدوود نہ رکھا بلکہ ان کو شعائیر اسلام یعنی اسلام کے فرائض اور عبادات کے خلاف استعمال کیا اور ایسے احکام نافذ کئے جن کی بجاآوری کے لئے سرکاری افسران جیسے کوتوال اور صوبے دار مقرر کئے۔ ان افسروں کے نام جو ہدایات تھیں۔ ان میں کہا گیا تھا کہ گائے اور بھینس کو ذبح نہ کیا جائے اور بارہ (12) سال کے کم بچوں کا ختنہ نہ کیا جائے اس طرح نکاح اور شادی کے معاملوں میں بھی اکبر کے خیالات اسلامی طریقوں سے مختلف تھے جن میں ہندوؤں کے رسم و رواج شامل تھے اور اپنی حکومت کے کارکنوں کو مقرر کیا جاتا تھا جن کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ دلہا دلہن کے متعلق اطلاع حاصل کریں کہ وہ آئین اکبری پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔

اکبر کے ان قواعد و احکام کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی میں کئی باتیں ایسی تھیں جو مسلمانوں کو کھٹکتی تھیں۔ مثلاً گوشت کھانے سے اجتناب اور یہ کہ ترک گوشت خوری گناہ نہیں بلکہ عبادت کا ایک جز ہے۔ سورج اور روشنی کے متعلق بھی اکبر کا جو عقیدہ تھا اسے مسلمان آفتاب پرستش کہتے تھے۔ اکبر کو معلوم تھا کہ اگر سورج اور روشنی کی پرستش کو آذر پرستی یعنی آگ کی پوجا کہا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے عقیدے کو ثابت کرنے کے لئے سورہ شمس کا حوالہ دیا اور کہا کہ قرآن میں سورج کا ذکر ہے اس لئے سورج کی پرستش کرنا کوئی گناہ نہیں بلکہ یہ اللہ کے نور کا احترام ہے اور چند مشرک عالموں نے بھی اکبر کے اس ناپاک ارادے کو اس آیت سے حمایت کی کہ قرآن میں اللہ نے فرمایا اَللّٰہُ نُوَرُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس لئے سورج پرستش اللہ کے نور کی پرستش ہے۔ یعنی سورج کی پوجا کرنا دراصل خدا کی پوجا کرنا ہے۔ اکبر نے شاید تعظیم آفتاب کے متعلق یہ خیالات پارسی مذہب آتش پرستوں کے مذہب سے اخذ کئے تھے۔ اس لئے پارسیوں کو خوش کرنے کے لئے ایسا کہتے تھے۔ اکبر نے ہندوؤں کے بہت سارے رسم و رواج اختیار کئے تھے۔ جیسے تلادان، وزن برابر خیرات جس میں ہندو سونا، چاول اور قیمتی چیزیں اپنے برابر تول کر دان یعنی خیرات کردیتے ہیں اور دیوالی کے موقع پر گائے کی پرستش کرتے تھے۔ اکبر کے متعلق ان کے خیالات سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آئین اکبری کے مطابق جو اعمال و اشغال، کام کاج شاہی مریدوں کے لئے مدون ہوئے تھے یعنی ترتیب دیئے گئے تھے وہ اسلامی نقطہ نظر سے بالکل قابل اعتراض تھے اور اکبر کی بدعتوں کے متعلق ابوالفضل نے جو تفصیلات دی ان میں انہوں نے جھوٹ اور خوشامد سے کام نہیں لیا بلکہ وہ اپنی بات میں صحیح تھے کیونکہ وہ خود بھی اکبر کے اس نئے مذہب دین الٰہی کے قائل تھے اور وہ اکبر کے اس ارادے سے واقف تھے کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا ایسا بادشاہ دیکھنا چاہتے تھے۔ کہ ہندو اسے ہندو سمجھیں اور مسلمان اسے مسلمان تسلیم کریں اور پارسی، عیسائی اور جین سب بادشاہ کو اپنا اپنا ہم عقیدہ تسلیم کریں لیکن مسلمان امرأ کو بادشاہ کا یہ طریقہ بالکل ناپسند تھا اور بادشاہ نے آفتاب روشنی اور نور کی تعظیم و تکریم کے جو انوکھے اور مضحکہ خیز طریقے اختیار کئے ان بے ہودہ خیالات نے بھی مسلمانوں کا دل کھٹا کردیا اور بالآخر حالات یہ ہوگئے کہ مسلمانوں کو بادشاہ کے ان غیر اسلامی عقئید سے بادشاہ کی نفرت ہوگئی۔

اکبر کا نیا مذہب دین الٰہی

اس بات میں اب شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ اکبر نے ایک نیا دین، دین الٰہی کے نام سے شروع کیا تھا۔ اختلافات صرف اس بات پر ہے کہ ان کا یہ نیا دین ایک نیا مذہب تھا یا مذہب پر چلنے کا ایک طریقہ ، مسلک (Cult) تھا۔ یعنی کیا دین الٰہی چار مسلکوں کی طرح ایک پانچواں مسلک تھا یا مذہب اسلام کے مقابلے میں ایک نیا مذہب تھا جو دنیا کے سارے مذہبوں کی خاص خاص باتوں پر قائم کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین الٰہی اکبر کا تیار کردہ ایک نیا مذہب تھا جس کی بنیاد ہندو مذہب پر تھی اور جس میں ہر مذہب کی کم وبیش ترجمانی تھی اور ایک جلیل القدر محدث شیخ عبدالحق جیسے متقی اور معلم نے اسے نبوت کا دعویٰ قرار دیا۔ اگرچہ اکبر نے بظاہر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اکبری طریقے کے سب سے بڑے مخالف بدایونی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ مذہب اسلام کا انتشار بادشاہ کے دعوے سے ہوا۔ ایک پرتگیز پادری نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ اکبر نے دین الٰہی کے نام سے اپنا ایک نیا مذہب جاری کیا اور اس دین الٰہی میں ابوالفضل نے مکمل ساتھ دیا اور اسے مَرتب کرنے میں پوری مدد کی۔ لیکن اکبر کے اس نئے مذہب کو ابوالفضل مذہب نہیں بلکہ ایک طریقہ ، مسلک (Cult) قرار دیتے ہیں اور بدایونی اس مسلک کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد اس کے ماننے والوں کی کمزوریوں جیسے طمع، لالچ، خوشامد، خودبینی اور خود پسندی پر قائم تھی۔ اکبر نے اپنے اس نئے مذہب میں ہندوؤں کو پسند آنی والی کئی چیزیں داخل کیں تاکہ اس طریقہ عبادت کو ہندوؤں میں رائج کیا جائے لیکن ہندوؤں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس طرح کی عبادت کو انہوں نے مسترد کیا اور مخالفت کرنے والوں میں امیر الاَمرا راجہ بھگوان داس پیش پیش تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ مانا جائے کہ ہندو اور مسلمان کے دونوں مذہبوں میں خرابیاں موجود ہیں تو ان سے بہتر فرقہ کونسا ہے جس کے ہم قائل ہوسکیں۔ ان باتوں سے بادشاہ لاجواب ہوا اور اس پلان کو اپنے دماغ سے خارج کردیا۔ اکبر کی مذہبی زندگی میں جو اختلاف رائے تھا وہ عہد حاضر تک باقی رہا۔ اس بارے میں پاکستان کے ایک مشہور و معروف عالم اور مورخ اشتیاق حسین نے اپنی کتاب The Muslim community of the Indo-Pak subcontinent میں لکھا ہے:

اردو ترجمہ: دور حاضر کے مفتیوں نے اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت بہت کچھ لکھا بعض نے زیادہ تر بدایونی پر انحصار کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اکبر نے اسلام کو بالکل ترک کیا اور ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی اور بعض دوسروں کی رائے یہ ہے کہ نئے مذہب کی بنیاد ڈالنے سے ان کا مقصد مذہب اسلام سے تجاوز اور انحراف (Deviation) نہ تھا اور بدایونی کے اکبر کے خلاف جو بیانات تھے ان کو زیادہ وسیع مفہوم دیا گیا جس کے لئے مغربی مترجمین ذمہ دار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا مذید کہنا ہے کہ بدایونی ایک ذہین اہل قلم تھے ان یہاتنی قابلیت تھی کہ وہ جو کہتے تھے اور لکھتے تھے سننے والے اور پڑھنے والے اسے حرف آخر سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب دراصل یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اکبر کو بے دین اور ملحد قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ انہوں نے دین کے بارے میں جو تبدیلی لائی یا لانا چاہتے تھے وہ دین سے انحراف نہیں بلکہ تجدید احیائے دین یعنی دین میں ایک نیا رنگ لانا تھا لیکن بدایونی نے اکبر کے اس نظریہ تجدید دین کو اس طرح پیش کیا کہ اکبر نے دراصل دین میں نیا گل کِھلاکر ایک نیا فتنہ اٹھایا۔ کیونکہ انہوں نے ایسے کام کئے جن سے وہ اور ان کے دین کو ماننے والے اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سورج کو اللہ کا نور سمجھ کر اس کی تعظیم کرنا۔ آتش پرستوں کا عقیدہ ہے جو توحید کے منافی ہے۔ لیکن یہ اکبر کے دین الٰہی کا ایک خاص جَز تھا۔ اس لئے وہ سب مسلمان علمائ، وزرا اور اکبر کے دیگر درباری اور حامی جنہوں نے اکبر کے نئے دین کو تسلیم کیا اسلام سے خارج ہوگئے۔ یہ بدایون کا نظریہ اسلام تھا اور اس نظریے کے مطابق انہوں نے اکبر کو بے دین قرار دیا جبکہ ابوالفضل اور ان کے ہم خیال ساتھیوں نے اکبر کو مجّدد، دین میں تجدید کرنے والا یعنی دین کو نئے سرے سے پیش کرنے والا قرار دیا اور ان کا مکمل ساتھ دیا۔ حالانکہ مجدد وہ ہوتا ہے جو مسلمانوں میں رائج بدعات کی اصلاح کرتے ہیں۔ لیکن اکبر کا دین الٰہی بدعات کا شاہکار یعنی بڑا کارنامہ ہے۔ اس طرح سے ابوالفضل کی دین الٰہی کی حمایت کی پالیسی واضح ہوگئی۔ اور بعد میں انہیں اکبر کے بیٹے جہانگیر سے اختلاف ہوا اور ملک کے تمام دین پسند علما اور فقہا اکبر اور ان کے مشیر ابوالفضل کے خلاف ہوگئے اور مخالفوں کے اصرار پر اکبر نے ابوالفضل کو 1599ئ میں دکن بھیج دیا اور کچھ وقت کے بعد اسے اپنے پاس دہلی واپس بلایا لیکن جہانگیر کو خبر ملی کہ ابوالفضل کو بادشاہ نے اپنے پاس بلایا اور وہ بادشاہ کے پاس دہلی جارہے ہیں۔ چونکہ ابوالفضل کو راجا نرسنگھ دیو کے علاقے سے گزرنا تھا نرسنگھ کو اطلاع ملی کہ ابوالفضل راجہ کے ساتھ لڑائی کرنے کے لئے آرہے ہیں انہوں نے ایک بڑی فوج کو ساتھ لے کر ابوالفضل کا مقابلہ کیا چونکہ

ابوالفضل کے ساتھ ایک مختصر جماعت تھی۔ انہوں نے بڑی بہادری سے لڑا لیکن وہ میدان جنگ میں مارے گئے۔ ان کی موت کو جہانگر کی سازش قرار دیا گیا کیونکہ جہانگیر کے ساتھ ان کی دشمنی تھی کہا جاتا ہے کہ ابوالفضل کا سر ان کے جسم سے کاٹ کر جہانگیر کے پاس بھیج دیا گیا اور ان کے جسد بے سر (سر کے بغیر) جسم کو گوالیار میں دفن کیا گیا۔ اس طرح ابوالفضل اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

خان اعظم عزیز کوکہ

مرزا عزیز کوکہ المعروف خان اعظم اکبر بادشاہ کے رضائی بھائی تھے۔ اکبر نے انہیں خان اعظم کا خطاب دے کر اپنے دربار میں شامل کیا تھا اور وہ ان کی حکومت کے رکن اور فوج کے سپاہ سالار تھے۔ انہوں نے کئی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ گجرات کو انہوں نے ہی فتح کیا لیکن وہ اکبر کی بدعتوں اور ان کے نئے مذہب دین الٰہی سے ناراض تھے۔ لیکن جب اکبر کی بدعتوں کی وجہ سے بہار اور بنگال میں بغاوت ہوئی تو اکبر کی بدعتوں کے خلاف ہونے کے باوجود خان اعظم نے بطور ایک وفادار رکن سلطنت جان کو خطرے میں ڈال کر اس بغاوت کو ناکام کردیا۔

تاریخ اسلام میں خان اعظم کا بلند مقام ہے کیونکہ انہوں نے عہد اکبری میں وہی دینی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کی جو علاؤالدین خلجی کی محفل خاص میں علاالملک نے انجام دی تھی۔ لیکن بظاہر وہ اس میں ناکام رہے کیونکہ اکبر کے ساتھ ابوالفضل جیسے اہل علم اور مشیر تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے علاالملک کی طرح اکبری حکومت کی خاطر قربانیاں دیں اور بہت حد تک حالات کو سدھارنے میں کامیاب رہے۔ خان اعظم جب بنگال سے فتح پور واپس آئے تو اس وقت اکبر کے دبار میں مذہبی بحثیں زوروں پر تھیں۔ بدایونی نے انہیں اکبر کے دین الٰہی کا حامی (Supporter) قرار دیا۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ممکن ہے خان اعظم نے دوسروں کے سامنے بادشاہ کے خیالات کی تردید مناسب نہ سمجھی ہو لیکن بدایونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تناسخ یعنی تبدیلی مذہب کے قائل ہو چکے تھے۔ بدایونی نے خان اعظم کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ جب وہ بنگال سے فتح پور آئے تو انہوں نے مذہبی معاملات کے متعلق سخنان درشت یعنی سخت الفاظ کہے۔ انہوں نے بیربل اور ابوالفضل کو بادشاہ کے حضور میں گھسیٹ کر لایا اور اپنی صفائی پیش کی۔ لیکن خان اعظم کو بادشاہ سے جدا کرنے جب مخالفین نے انہیں گجرات بھجوادیا تو وہ چھ (6) سال تک کے لئے دارالسلطنت نہ آئے۔ حالانکہ شاہی دربار کا قاعدہ تھا کہ ہر طرف کے گورنر صاحبان بادشاہ کے پاس آتے رہیں اور انہیں حالات سے واقف کرتے رہیں۔ ان کی طلب میں انہیں کئی فرمان حکم نامے بھیجے گئے لیکن وہ حاضر دربار نہ ہوئے۔

دراصل اکبر بادشاہ کے دین الٰہی کی مخالفت کی وجہ سے خان اعظم مکہ چلے گئے ۔ کیونکہ انہیں اکبر کی وفاداری اور دین الٰہی کا حمایتی ہونے کے الزام کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ان کے وطن چھوڑنے پر اکبر کو سخت دکھ ہوا۔ چونکہ وہ خان اعظم کے رضائی بھائی تھے۔ اس لئے انہیں خان کی والدہ، رضائی ماں کی ناراضگی کو بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اور اس ناراضگی سے اکبر کو بڑی تشویش لاحق ہوئی تھی۔ لیکن انہوں نے حوصلے اور تدبر سے کام لیا اور خان کے متعلق اپنا غصہ ٹھنڈا کیا اور خان صاحب کے جو بیٹے دارالسلطنت میں رہ گئے تھے انہیں بڑے بڑے منصبوں اور عہدوں پر تعینات کیا اور خان اعظم کو واپس آنے کے لئے ایک محبت بھرا اور برادرانہ خط بھیجا کہ میں نہیں چاہتا ہوں کہ آپ پر دیش میں مارے مارے پھریں اور لوگوں کے طعنے سنیں اب وقت ہے کہ آپ واپس آجائیں تاکہ آپ کی جدائی سے ہمارے دلوں کو جو زخم لگے ہیں ان کی مرہم پٹی ہوجائے۔ لیکن خان اعظم نے واپس آنے سے انکار کیا اور خط کے جواب میں یہ شکایت کی کہ بادشاہ عالی نے ہندوؤں کو اعلیٰ منصب دئے اور تاریخ میں یہ بات ثبت رہ جائے گی اور بدنامی کا باعث بنے گی کہ کافروں کو مسلمانوں پر ترجیح دی گئی۔ آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا کہ مجھے اپنی سلطنت میں شامل ہونے کا موقعہ دیا کہ گجرات کی حکومت سے سرفراز کیا اور مجھے احساس ہے کہ میں آپ کے احسان کا پرورش یافتہ ہوں لیکن میں نہیں چاہتا ہوں کہ کافرانِ ہند کی غلامی کرکے ہندوستان میں سپرد خاک ہوجاؤں اور جو لوگ بادشاہ عالی مقام کو دین محمدیؐ سے بیگانہ اور مُجتنب یعنی دین سے علاحدگی اختیار کرنے والا بتاتے ہیں وہ ہرگز ان کے خیر خواہ نہیں ہوسکتے ہیں ۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی بادشاہ گزرے ہیں جو بڑے جاہ و جلال والے تھے۔ لیکن کسی کے دل میں یہ خیال نہ ہوا کہ وہ دین محمدیؐ میں ترمیم اور دعویٰ پیغمبری کا خیال کرے۔ انہوں نے شیخ سعدی کا شعر نقل کیا:

خلاف پیغمبر کسے رہ گزید

ہرگزبہ منزل نخواہد رسید

جس کسی نے خلاف پیغمبر کا راستہ اختیار کیا وہ منزل مقصد کو ہرگز نہ پہنچ پایا۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ خان اعظم کا جو نقطۂ نظر تھا وہ اکبر کے دین الٰہی کے خلاف تھا اور وہ انہیں شریعت محمدیؐ پر لانا چاہتے تھے۔

خان اعظم کے خلاف جو کہا گیا ہے کہ وہ مکہ سے واپس آکر پھر سے اکبر کے دربار میں شامل ہو گئے اور اکبر کی وفاداری کر کے ان کے ہر نقش قدم پر چل پڑے۔ یعنی پھر سے اکبر کا دین الٰہی قبول کیا اور اس طرح ان کی زندگی کا کردار متضاد بنایا گیا بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خان اعظم نے اکبر کے دین کو کبھی بھی قبول نہ کیا۔ اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو انہیں مکہ ہجرت نہ کرنی پڑتی۔ دراصل اکبر کے دور حکومت میں جو فضا اسلام کے حق میں تھی خان اعظم اس سے متفق تھے اور یہ بات کہ ان کے خیالات بدل چکے تھے اور وہ اب ابوالفضل کا ہم خیال ہو کر دین الٰہی پر راضی ہو گئے تھے بالکل غلط ہے۔ سچ یہ ہے کہ خان اعظم کا مکہ معظمہ جانا ایک مبارک اقدام تھا اور وہاں سے واپس آکر انہوں نے دین الٰہی کی مخالفت کر کے ملک میں جو فضا پیدا کر دی اس لحاظ سے ان کا واپس آنا ایک کارِ ثواب تھا۔ خان اعظم کا زمانہ اکبر کے اقتدار کے ساتھ ہی ختم ہوا۔

اکبر کی وفات

ابوالفضل کی وفات کے بعد اکبر تین سال تک زندہ رہے۔ تزک جہانگیری میں لکھا گیا ہے کہ انہوں نے مرنے کے وقت کلمہ شہادت پڑھا اور سورہ یٰس پڑھوا کر سن لی اور بطور ایک راسخ العقیدہ مسلمان اس دنیائے فانی سے چل بسے۔ لیکن اس بات کی معتبر ذرائع سے تصدیق نہ ہو سکی۔ سوائے اس کے ہندوستان آئے ہوئے انگلستان کے سفیر سر تھامس راؤ (Sir Thoms Rao) نے اکبر کے انتقال کے بیس (20) سال بعد اپنی رائے کا اظہار کیا کہ اکبر کی وفات بطور مسلمان ہوئی اور ایک پرتگیزی پادری بوٹیلو (Botilo) نے کہا کہ اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا کہ وہ تادم حیات اپنے قائم کردہ دین پر قائم رہے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ بالآخر دین محمدیؐ پر ہی وفات پا گئے۔ واللہ اعلم بالثواب۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

محمد سلیم جہانگیر کی تخت نشینی

اکبر کی وفات کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر نے تخت شاہی پر قدم رکھا انہوں نے اپنے باپ کے نافذ کئے ہوئے تمام غیر شرعی قوانین مسترد کئے اور اس طرح اکبر کے غیر اسلامی دین الٰہی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گُل ہوگیا اور مسلمانوں کو فتنۂ اکبر سے نجات مل گئی۔ انہوں نے قرآن کی روشنی میں شرح اسلام کی پیروی کرکے اپنی حکومت کی ابتدا کی انہوں نے تخت نشین ہوتے ہی اسلامی دستور کے مطابق احکام جاری کئے۔ ان میں ایک حکم یہ تھا کہ جو لوگ لاوارث مرجائیں ان کی جائیداد حکومت کے قبضے میں نہ لی جائے گی بلکہ اسے شرعی حَکم کے مطابق مساجد اور دیگر عوامی کاموں پر خرچ کی جائے اس شرعی حکم سے ظاہر ہوتا ہے جہانگیر نے ابتدا سے ہی شرع محمدیؐ پر عمل کیا اور شرع اسلامی کی پاسداری کرکے اکبر کی پیدا کردہ مذہبی الجھنوں اور کشیدگیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ شیخ فرید الدین جو اکبر کے عہد حکومت میں میر بخشی یعنی تنخواہ تقسیم کرنے والے کے عہدے پر فائض تھے اور ایک ذی عزت و باوقار کارکن تھے۔ ان کا مرتبہ بڑھا کر انہیں پنجاب کا گورنر مقرر کیا اور اسی عہدے پر انہوں نے 1616ئ میں وفات پائی۔

مُجدد الف ثانی جہانگیر کے دربار میں

حضرت مجُدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی جہانگیر کے دربار کے علمائ میں بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ لیکن بادشاہ کے دربار میں شکایت ہوئی کہ شیخ نے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا اور اُنہوں نے اپنے آپ کو مجدد الف ثانی یعنی ہزار سال کے بعد دوسرے مجدد دین کی تجدید کرنے والا قرار دیا اور بادشاہ کے سجدہ تعظیم سے انکار کرتے ہیں۔ ہزاروں لوگ ان کے فرمانبردار اور مرید بن گئے۔ اس کا اثر حکومت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ شیخ کے متعلق یہ خرافات بے ہودہ باتیں سن کر جہانگیر بادشاہ نے حضرت مجدد الف ثانی کو اپنے دربار میں بلایا اور بادشاہ نے جب شیخ پر لگائے گئے الزامات کی تحقیق کی تو انہیں معلوم ہوا کہ اکثر علما شیخ کے خلاف ہوگئے ہیں اور ان کے خلاف ایک شورش برپا ہوگئی ہے۔ تو انہوں نے بغاوت کےپیش نظر حکمت عملی سے حضرت مجدد کو فی الوقت جیل بھجوادیا تاکہ عوام کی شورش مدہم پڑجائے یعنی کم ہوجائے اور ان کی جائیداد بھی ضبط کردی گئی۔ جب شیخ کے مخالفین کی آواز دب گئی اور لوگ انہیں بھول گئے تو بادشاہ نے ان کی رہائی کا حکم صادر کیا اور شیخ کو رہائی نصیب ہونے کے بعدفوج میں ایک بڑے عہدے پر تعینات کیا۔ جہانگیر کی پزیرائی کے بعد انہوں نے تصوف کو شریعت میں لایا جس سے شریعت اور طریقت یعنی اسلامی قانون اور تصوف کے اختلاف کم ہوگئے۔ آپ نے وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا اور دونوں نظریات کے درمیان اختلاف ختم کرنے کی کوشش کی۔

وحدت الوجود (Pentheism) کا نظریہ پیش خدمت

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا کہ خدا ہر مخلوق اور ہر شے میں موجود ہے۔ اس لئے ہر مخلوق اور ہر شئے قابل تعظیم ہے۔ لہذا انسان کو تعظیم کے لئے سجدہ کرنا جائز ہے۔ اس حیثیت سے ہندوؤں کا پتھر کی مورتیوں کو سجدہ کرنا ان کے بھگوانوں کی تعظیم ہے نہ کہ پتھروں کو سجدہ کرنا مراد ہے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ کئی مغل بادشاہوں کے دربار میں اس طرح کے سجدے کا رواج تھا جسے اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں خلاف شریعت اور ناجائز عمل قرار دے کر ختم کردیا گیا۔

The belief in many or all gods or the belief that God exists in all (وحدت الوجود) things, animals and people within the universe is called Pantheism and the believer of many gods is called panthiest.

وحدت الوجود اشتراکیت: وحدت الوجود کا عقیدہ اشتراکیت کا نظریہ ہے کہ خدا تمام مظاہر فطرت میں موجود ہے اور یہ کہ تمام دیوتاؤں میں یقین رکھنا یا بڑی تعداد میں ان کی عبادت کرنا اصلی عبادت ہے۔ اس طرح عمل کرنے والے کو مشرک کہتے ہیں۔

The belief that there is only one God and all the creatures are (وحدت الشہود) created by Him alone, is called monotheism and the believer of God is .called monotheist

وحدت الشہود: یہ عقیدہ ہے کہ صرف ایک خدا ہے اور ساری مخلوقات کو اسی نےپیدا کیا۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے کو موُحِد یعنی توحید والا کہتے ہیں۔

Atheism is a belief that God or gods do not exist and one who does (دہریت) .not believe in God or gods is called an athiest

دہریت: خدا کے وجود کے انکار کو دہریت کہتے ہیں اور انکار کرنے والے کو دہریہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق یہ کائنات اور اس میں موجود تمام مخلوقات خود ساختہ ہیں یعنی ہر کوئی چیز خودپیدا ہوئی ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والے کو دہریہ کہتے ہیں۔

تاریخ اسلام کا یہی وہ دور ہے جب مسلمان فرقوں، ذاتوں اور سلسلوں میں بٹ گئے۔ کوئی سیُد ہے کوئی صدیقی کوئی فاروقی اور کوئی عثمانی اور علوی ہے۔ اسی طرح خاندان کے نام پر کوئی نقشبندی، کوئی سہروردی، کوئی فاروقی، کوئی مخدومی، کوئی جیلانی، کوئی کرمانی اور کوئی سلطانی جیسی ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں اور آج تک اس پر عمل پیرا ہیں اور آج بھی اونچی ذات یا سلسلہ سے تعلق رکھنے والے نیچی ذات یا عام ذات والے لوگوں پر اپنے آپ کو ترجیح دیتے ہیں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر اپنی ذات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اسلامی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیائے فانی

سے رخصت لینے کے بعد مسلمان پہلے مسلکوں اور پھر فرقوں میں بٹ گئے۔ پہلے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی نام کے چار مسلک تھے اور یہ چاروں مسلک ایک خدا کی بندگی اور رسولؐ کی اطاعت کی ترجمانی کرتے تھے اور نماز جیسی عبادت کے طریقے میں ایک مسلک کے لوگ ہاتھ باندھ کر رفع یدین (ہاتھ اٹھائے) بغیر نماز پڑھتے تھے۔ جبکہ دوسرے مسلک کے لوگ رفع الدین یعنی ہاتھ اٹھاکر اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے تھے۔ لیکن ان میں شرک و بدعات کی کوئی آلائش نہ تھی۔ لیکن آج اسے مسلمانوں کی بدقسمتی سمجھیں یا اللہ کی نافرمانی کی سزا سمجھیں کہ مسلمان مزید فرقوں میں بٹ رہے ہیں۔ جن کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی کی تھی کہ میری امت بہتر(72) فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں صرف ایک فرقہ میری سنت پر قائم ہوگا۔ (واللہ اعلم)

جہانگیر کو اکبر کے منصوبوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ ابوالفضل کے سخت مخالف تھے۔یہاں تک کہ انہوں نے اسے جنگ میں قتل کروایا۔ تخت نشینی کے بعد انہوں نے جو احکام جاری کئے ان سے ان کی شریعت اسلامی سے دلچسپی اور محبت واضح ہوجاتی ہے ۔ وہ الہاد یعنی دین حق سے دوری کے سخت مخالف تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت مجدد نے اکبر کے رائج کردہ دین الٰہی کو ختم کیا تو جہانگیر نے انہیں قید کیوں کیا۔ جہانگیر نے خود حضرت مجدد کی طلبی اور قید کا واقعہ بڑی وضاحت سے بیان کیا وہ اپنی تصنیف کردہ کتاب تزک جہانگری میں لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ مجدد کی حراست کی ایک بڑی وجہ ان کا غرور اور تفاخر تھی۔ غالباً اس کا اشارہ اس طرف تھا کہ انہوں نے بادشاہ کو سجدہ تعظیم نہ کیا بلکہ اس کی مخالفت کی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انہیں چند دنوں کے لئے قید میں رکھنے سے ان کے خلاف جو عوامی شورش تھی وہ تھم جائے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مجدد کے خلاف ان کے مخالفین نے مخالفت کا ایک بڑا محاذ کھڑا کردیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد بادشاہ نے انہیں فوراً حکومت میں شامل کرکے ایک اچھا عہدہ دیا اور اس طرح عزت کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

حضرت مجدد الف ثانی کی مذہبی خدمات

مولنا آزاد اور دیگر تذکرہ نگاروں نے حضرت مجدد الف ثانی کو اپنے وقت کا مَصلح دین یعنی دین کی اصلاح کرنے والا قرار دیا ہے۔ ہندوؤں کی ہندومت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی طرف حضرت مجدد نے اصلاح کرنے کی توجہ دلائی۔ انہوں نے عامۃ المسلمین اور جمہور علما و صوفیہ کے غیر شرعی خیالات کی اصلاح کی اور عہد اکبری کی مذہبی بے قاعدگیوں کے اثرات دور کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں شرع اور دین نے دوبارہ فروغ حاصل کیا

حضرت مجدد کی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اس تصوف کی ترجمانی کی جو شریعت کے مطابق ہے۔ ہندوستان میں شروع سے ہی اسلام پر تصوف کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ کسی کو یہ خیال تک نہ تھا کہ صوفیانہ سلسلے میں داخل ہوئے بغیر کوئی اسلام کی برکت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اس لئے مجدد کے نزدیک اسلام کی بڑی خدمت یہ تھی کہ ایسے صوفیانہ سلسلے کو ترقی دی جائے جو شریعت سے آزاد نہ ہو۔ انہوں نے یہ کام کیا کہ ہندوستان کے مشہور اور معروف سلسلوں کو چھوڑ کر ایک ایسے طریقے کی اشاعت کی جس میں شرع اسلامی کی پیروی پر زور دیا گیا ہے اور اِتباع سنت و اجتناب بدعت یعنی سنتوں کی تعمیل اور بدعتوں سے چھٹکارا ہے۔ جس میں اصحاب کبار کا طریقہ مشروط ہے اور نبوت کی تعلیم شامل ہے۔ جس میں نہ چلہ کشی کی ضرورت ہے نہ ذکر بالجہر کی، نہ قبروں کو روشن کرنا، نہ قبروں پر غلاف اور چادر چڑھانا، نہ عورتوں کا ہجوم نہ سجدہ تعظیم، نہ کسی کے سامنے سر جھکانا اور نہ عقیدت کا بوسہ دینا، نہ توحید وجودی یعنی وحدت الوجود اور دعوائے انا الحق، نہ مرید عورتوں کی ان کے پیروں فقیروں سے بے پردگی اس طرح آپ نے صرف طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا جس میں احکام شریعت کو سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ بلکہ طریقت کے مقابلے میں شریعت کی اہمیت واضح کردی۔ آپ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ دنیائی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ آپ صحابہ کرام کو اولیائے کرام سے بزرگ تر مانتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ حال شریعت کے تابع ہے نہ کہ شریعت احوال کے تابع ہے۔ یعنی زمانہ شریعت کے طابع ہوتا ہے نہ کہ شریعت زمانوں کے طابع ہوتا ہے۔ جب آپ نے دیکھا کہ صوفیائے مَتقدمین سابقین یعنی پہلے زمانے کے صوفیا کے کلام کی خلافِ شرع ترجمانی ہوتی ہے تو انہوں نے اپنے مکتوبات میں تشریح اور تاویل کرکے انہیں شرح کے مطابق ثابت کیا۔ مشائخ مَتاخِرین یعنی پیچھے آنے والے مشائخ بعض خلاف شرع امور کو یہ فرما کر رُد کرتے کہ یہ لازم لاتباع نہیں یعنی ان کی اتباع کرنا لازمی نہیں درحقیقت آپ وہ عالم طریقت تھے جنہوں نے تاویل و تشریح اور مخالف شرع اقوال و احوال سے علاحدگی اختیار کرکے تصوف کو احکام شرعی میں لے آئے جس سے تصوف کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں اور طریقت و شریعت کے اختلافات بھی کم ہوگئے۔

آپ نے عقیدہ وحدت الوجود کی نئی توجیہ کر کے وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا اور مسلمان صوفیا اور علما کے اختلافات رفع کردیئے۔ آپ خود ایک طویل مدت تک وحدت الوجود کی کھوج میں سرگردان رہے۔ لیکن عالم اور مُحب شریعت ہونے کی وجہ سے وہ اس اختلاف سے واقف تھے جو اہل شریعت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے مکتوب سے اختلاف کی گتھی کو سلجھاکر عقیدہ کشائی کی یعنی الجھنوں کو دور کر کے مشکلات کو آسان کردیا۔ آپ کا قول ہے کہ مقام وحدت الوجود سالک، صوفی اصطلاع میں خدا کے قرب کے ساتھ دونوں دین داری اور دنیاداری چاہنے والے کو ابتدائی سلوک یعنی ابتدائی دور کی ریاضت و عبادت کرنے کے دوران پیش آتا ہے جس سے مستحکم ارادے کے ساتھ گزرنا چاہئے اور جو شخص اس بالا مقام پر پہنچتا ہے اس پر وحدت الشہود کا انکشاف ہوجاتا ہے۔ جو شریعت کے عین مطابق ہے۔ شریعت کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ نے ردِ بدعت کا ایک بڑا کام کیا کہ ان بدعات کا خاتمہ کردیا جن کی وجہ سے نہ صرف دین میں رخنے اور اختلافات پیدا ہوتے تھے بلکہ اجتماعی نظام میں بھی انتشار پیدا ہوتا تھا۔ آپ نے ردِ بدعت کی مہم چلاکر ان تمام بدعات کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی جن سے قومی نظام میں فرقہ بندی اور خلل ہونے کا اندیشہ تھا۔ چونکہ ایران سے مغلیہ حکمرانوں کو گہرے روابط تھے اس لئے ہندوستان میں شیعہ فرقے کے لوگوں کے روابط بڑھنے لگے تھے۔ آپ نے ان سے مصالحت کرنے، انہیں سمجھانے اور انہیں روکنے کی زبردست کوشش کی۔ شیعہ لوگ مسلمانوں کا وہ فرقہ ہے جو حضرت علی کوپیغمبر اسلام کے بعد خلافت کا حقدار مانتا ہے۔ آپ نے مہدیت، امام مہدی کے ظہور کے دعویٰ کرنے والوں سے بھی اختلاف کیا۔ مہدی کا مطلب ہدایت یافتہ رہنما ہے۔ یہ شیعہ مسلمانوں کے بارھویں امام ہیں۔ جن کا ظہور قرب قیامت یعنی قیامت کے قریب آنے کے وقت میں ہوگا۔ آپ نے تصوف میں جو بدعات پائے ان کے خلاف آواز اٹھائی اور احیائے العلوم دین اور خلافت راشدین کے طریقہ اسلام کو زندہ کیا اور ایک ایسا نظام قائم کیا جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے بعد آپ کے شاگردوں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر آپ کے دینی خیالات، خواہشات اور اِرادات کی اشاعت کی اور آپ کے فرزندان اور محبان نے آپ کا کام جاری رکھا جو آج تک جاری ہے جس سے مسلمان مستفید ہورہے ہیں۔

اختلافات کا حل

حضرت مجدد نے ہندوؤں کی اپنے مذہب کی جارحانہ اِحیا، اپنے عقیدہ کو دوبارہ رائج کرنے کی کوشش کا تَرکی بہ ترکی یعنی ادلے کے بدلے میں جواب دیا۔ وہ ہندومت اور اسلام کا میل ملاپ نہیں چاہتے تھے۔ انہیں جب ایک ہندو مذہبی رہنما نے مشورہ دیا کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں۔ اس لئے ہندو اور مسلمان ایک مشترکہ نظم اور مذہب کے مطابق زندگی گزاریں جس سے ملک میں امن و امان قائم ہوجائے گا۔ لیکن حضرت مجدد نے اس نقطۂ نظر کی تردید کی اور کہا کہ رام اور رحمان کو ایک جاننا بڑی نادانی ہے کیونکہ خالق اور مخلوق یعنی پیدا کرنے والا اور پیدا کیا ہوا ایک نہیں ہوسکتے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات اتنے بنیادی ہیں کہ دین الٰہی کو آئین بنا کر یا رام و رحمان کو ایک کہہ کر انہیں جوڑا نہیں جاسکتا ہے۔ یہ ایک بے مقصد اور ناکام کوشش ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے۔ باہمی امن و امان کی خاطر زیادہ سے زیادہ جو مسلمانوں کو گورا ہوگا وہ یہ ہے کہ مسلمانان بر دین خود باشد و کفار بر کیش خود۔ یعنی مسلمان اپنے دین پر اور کفار اپنے دین پر۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین۔ اور دینی اتحاد (Religious integration) کے بجائے مذہبی رواداری (Religious co-existence) ملک کے امن و امان کے لئے کافی ہے۔ ہندو مسلم اختلافات کے متعلق تاریخ نے ان کے نقطہ نظر کی تائید کی لہ اس غیر شرعی ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ یعنی اس مذہبی سازباز کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی دینی علوم کا نیا دور

اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی ایک بڑے عالم تھے اور وہ شریعت کی پیروی پر بڑا زور دیتے تھے۔ وہ واقعات کو قرآن و سنت کی روشنی میں پرکھتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ انہوں نے تصوف کو شریعت میں لانے کی مسلسل کوشش کی اور جو صوفی حلقوں میں مطلق العنانی یعنی خود مختاری اور آزاد خیالی پھیل گئی تھی۔ اس کی مخالفت کی لیکن وہ تصوف سے دور نہ تھے اور عالم شریعت کے ساتھ ساتھ وہ عالم تصوف بھی تھے۔ لیکن وہ شریعت کو تصوف پر ترجیح دیتے تھے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو بھی شریعت کے ساتھ ساتھ تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ لیکن تصوف سے گہرا لگاؤ ہونے کے باوجود وہ صوفی کم تھے اور شریعت کے عالم زیادہ انہوں نے حرمین جاکر علم حدیث کی تکمیل کی اور واپس آکر پورے ہندوستان میں علم دین کی اشاعت کی۔ انہوں نے علوم اسلامی کے دو بڑے سرچشموں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے اسلامی ہندوستان کا رشتہ جوڑ دیا جو ان کی ایک بہت بڑی اسلامی خدمت مانی جاتی ہے اور اس دینی خدمت کی بدولت انہیں علوم دین کی تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ شیخ عبدالحق کو حجاز میں شیخ عبدالوہاب متقی سے ملاقات ہوئی جنہوں نے مہدویت کو ختم کرنے میں زندگی صرف کردی۔ مہدویت شیعہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے بارہویں امام، امام مہدی کا ظہور قرب قیامت یعنی قیامت کے نزدیک آنے کے زمانے میں ہوگا۔ مہدی کا معنی ہے ہدایت یافتہ، رہنما، پیشوا، ہادی اور رہبر۔ مختصر یہ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے وہی راستہ اختیار کیا تھا جس پر صوفیہ حضرات کو مجدد الف ثانی لے جارہے تھے اور دونوں حضرات نے اسلامی ہندوستان میں جو دینی خدمت کی وہ اسلامی دنیا میں روز روشن کی طرح تابان ہے۔ جس کی بدولت دور حاضر کے مسلمان مستفید ہورہے ہیں اور انشا اللہ تاقیامت مستفید ہوتے رہیں گے۔

عہد شاہجہانی

شہاب الدین محمد شاہجہان کی تخت نشینی

جہانگیر بادشاہ کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند شاہجہان ہندوستان کے تخت نشین ہوئے۔ ان کے دور حکومت میں اکبر کے دین الٰہی کے خلاف جہانگیر کا اٹھایا ہوا قدم زیادہ مضبوط ہوگیا اور اسلام اور شعائر اسلامی یعنی اسلامی طریقے پر حکومت چلانے کے لئے زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جہانگیر کے زمانے میں عام لوگوں کے لئے درباری سجدہ یعنی بادشاہ کو سجدہ تعظیم کرنا برقرار تھا۔ شاہجہان نے اسے موقوف کردیا۔ وہ شریعت کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے اور علما وفضلا، عالموں اور فاضلوں کے بڑے قدردان تھے۔ نماز اور روزوں کے پابند تھے۔ ان کے درباری مورخوں کی گواہی کے مطابق انہیں نہ صرف نیک اور پابند شریعت مسلمانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ انہیں مجددین ملت یعنی قوم کی اصلاح کرنے والوں میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے مقابلے میں انہیں امور اسلامی کا زیادہ خیال رہتا تھا۔ ان کی حکومت کا ایک واقعہ ہے کہ خدمت شاہی میں ایک اطلاع پہنچی کہ علاقہ بھنبر موجودہ آزاد کشمیر میں مسلمان اپنی جہالت کی وجہ سے ہندوؤں کو اپنی بیٹیاں نکاح میں دیتے ہیں اور ان کی بیٹیاں اپنے بیٹوں کی نکاح میں لے آتے ہیں۔ اور جو ہندو لڑکی مسلم سسرال میں مرجاتی اسے دفن کیا جاتا ہے اور جو مسلمان لڑکی ہندو گھر میں فوت ہوجاتی ہے اسے جلایا جاتا ہے۔ دربار شاہی سے حکم ہوا کہ جس ہندو کے نکاح میں کوئی مسلمان عورت ہو تو اگر وہ ہندو مسلمان ہوجائے تو عورت سے اس کا نکاح شریعت اسلامی کے طریقے سے پڑھا جائے ورنہ مسلمان عورت کو اس سے جدا کیا جائے۔ اس حکمنامے کے بعد بہت ساری مسلمان عورتوں سے ہندو شوہروں سے خلاصی پائی اور انہوں نے مسلمانوں سے اسلامی شریعت کے مطابق نکاح کیا اس حکم نامے کے مطابق جن ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا انہیں آزاد کرادیا گیا اور جن مسجدوں پر قبضہ کیا گیا تھا ان کو بھی ہندوؤں کے قبضے سے واگزار کرکے مسلمانوں کے حوالے کردیا گیا اور غیر مسلم قابضوں سے جرمانہ وصول کیا گیا۔

بادشاہ کو ایک اور اطلاع آئی کہ کچھ لوگ آئین شرعی کی پیروی نہیں کرتے ہیں بلکہ انہوں نے گمراہ پیروں و فقیروں کے احکام کو قرآن وحدیث کا درجہ دے کر ملحدوں کا فریضہ اختیار کر رکھا ہے اور وہ بیویوں سے شرعی طور پر نکاح نہیں کرتے بلکہ ایک گائے یا بیل کو ذبح کرکے اپنے ہمسایوں اور رشتہ داروں کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کے بعد کسی عقد نکاح کے بغیر ازدواجی تعلقات شروع کر دیتے ہیں۔ طلاق کے معاملے میں وہ عورت کے ہاتھ میں تین کنکریاں تھما دیتے ہیں اور اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔بیوہ عورتیں ان کے رواج کے مطابق وراثت میں حصہ دار ہوتی تھیں لیکن میت کے وارث کو حق ہوتا تھا کہ وہ اس بیوہ عورت سے نکاح کرے یا اسے فروخت کرے۔ جو بد نصیب مسافر ان کی سر زمین میں پہنچ جاتا اسے یہ لوگ شکارِ حلال سمجھتے تھے اور اسے بیچ کر آمدنی کا ذریعہ بناتے یا غلام بنا کر اپنے گھر میں رکھتے تھے۔ یہ لوگ وراثت میں سے بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے۔ قتل غارت اور رہزنی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کو اپنی بڑھائی اور بہادری سمجھتے تھے۔

ان تمام برائیوں کو ختم کرنے کے لئے شاہ جہان بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ احکام شریعت کے مطابق ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کرکے سزا دی جائے تاکہ یہ ان برے کاموں سے باز آجائیں اس طرح ان بدعتوں اور برائیوں کا خاتمہ کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی پورے ہندوستان میں بدعتوں اور رسوم بد کے آثار موجود ہیں۔ جن میں ہندؤں کے علاوہ اکثر مسلمان بھی شامل ہیں۔ ان ظاہری خرابیوں کے علاوہ ملک میں وحدت الوجود نظریہ کی ایک مہلک بیماری فروغ پا رہی تھی جسے شاہجہان کے عہد حکومت میں ختم کردیا گیا۔ شاہجہان کے متعلق صرف ایک خلاف اسلام الزام ہے کہ وہ سجدہ تعظیم کے قائل تھے حالانکہ کچھ تذکرہ نگار اس رائے سے متفق نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

شاہ جہاں کے عہد حکومت میں جن عالموں اور فاضلوں کا نمایاں رول (Role) رہا ہے ان میں چند حضرات کا تذکرہ حسب ذیل ہے:

حضرت شیخ میاں میر قادری

میاں میر قادری قادریہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سندھ کے قدیم شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قاضیوں کے خاندان سے تھا جو علم و فضل میں بہت مشہور تھے۔ وہ بچپن میں یتیم ہوگئے لیکن دینی علوم آپ نے اچھی طرح حاصل کئے اور دینی تعلیم سے فارغ ہوکر آپ فوراً دنیائی زندگی سے لاتعلق ہوگئے اور شیخ سیوستانی کے مرید بن کر ایک پہاڑ پر قیام کیا پھر وہاں سے لاہور آئے اور دین اسلام کی تبلیغ شروع کی لیکن بعد میں وہ فنافی اللہ ہوگئے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی محبت اور معرفت میں ڈوب گئے اور تبلیغ دین کا کام چھوڑ کر گوشہ نشین ہوگئے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس طرح کی گوشہ نشینی اختیار کی کہ چالیس (40) سال تک لاہور کے لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ اس طرح کے ایک بزرگ لاہور میں موجود ہیں۔ آپ وحدت الوجود کی دلیل کو مانتے تھے اور اس کی تشہیر کرتے تھے۔
وحدت الوجود کا نظریہ ابن عربی نے پیش کیا یہ صوفیوں کا نظریہ ہے کہ خدا کا کوئی الگ وجود نہیں بلکہ خدا کی ذات دنیا کی ہر شئے اور ہر مخلوق میں موجود ہے۔ یہ نظریہ مجدد الف ثانی کے نظریہ وحدت الشہود کے مخالف ہے کہ ہر چیز کو خدا نے پیدا کیا اور ہر چیز خدا کے وجود کی گواہی دیتی ہے۔

میاں میر قادری ابن عربی کے مرید تھے اور وہ تمام عمر میں غیر شادی شدہ رہے۔ دارا شکوہ آپ کے بڑے معتقد تھے۔ انہوں نے آپ کی قبر پر درگاہ بنانے کا حکم دیا۔ لیکن ابھی درگاہ کی تعمیر ہو رہی تھی کہ دارا شکوہ کا شاہی تخت قضا و قدر نے الٹ دیا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ کن لوگوں نے مزار کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ مزار کے قریب دارا شکوہ کی رفیق حیات نادرہ بیگم کی قبر ہے۔

ملا شاہ قادری

میاں میر قادری کی وفات کے بعد دارا شکوہ نے میاں میر کے مرید خاص شاہ محمد المعروف ملا شاہ قادری سے بیعت لی۔ وہ بدخشان سے لاہور آئے اور میاں میر کے مرید ہوئے لیکن لاہور کی گرمی برداشت نہ کرسکے۔ اس لئے کشمیر آئے جہاں دارا شکوہ نے آپ کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کے پیر صاحب نے تیس (30) سال تک ایک لمحہ نیند نہ کی۔ ان غیر معمولی ریاضتوں اور عبادتوں کی وجہ سے ان کی شخصیت میں بڑی کشش اور کلام میں بڑی تاثیر پیدا ہوگئی تھی اور آپ کی خدمت میں جو لوگ مناظرہ کے لئے آتے تھے وہ ان کی خوش اخلاقی اور نرم کلامی سے متاثر ہوکر آپ سے بیعت لیتے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے۔ کشمیر آکر انہوں نے ایک شعر کہا کہ نقل کفر کفر نباشد یعنی کفر کی نقل کرنے سے کوئی کافر نہیں ہوجاتا۔ اس پر علمائے کشمیر نے ان کو کافر اور واجب القتل قرار دیا اور بادشاہ وقت شاہجہان سے استدعا کی کہ وہ اس کے خلاف حد شرعی جاری کریں۔ بادشاہ نے علمأ سے اتفاق کیا اور کشمیر کے گورنر کے نام فرمان لکھا کہ ملا شاہ کو قتل کیا جائے۔ لیکن دارا شکوہ نے سفارش کرکے ملا شاہ کی جان بچائی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد 1658ئ میں جب اورنگ زیب تخت نشین ہوئے تو لوگوں نے ملا شاہ کے خلاف دوبارہ آواز اٹھائی اورنگ زیب نے ان کو اپنے پاس بلایا لیکن بڑھاپے اور بیماری کا بہانہ بناکر وہ حاضر خدمت نہ ہوئے اور 1660ئ میں انکا انتقال ہوا۔

شیخ سرمد

سرمد شاہجہان کے دور حکومت کی ایک دلچسپ ہستی تھی۔ مذہبی تاریخ کا ایک دلچسپ آدمی ہونے کے علاوہ وہ ایک باعزت مورخ بھی مانے جاتے ہیں لیکن ان کی رباعیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی معنی آفرینی اور بھول بھلیوں میں گرفتار تھے۔ وہ اصل میں یہودی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہودی مذہب اور تورات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ مسلمان ہوگئے تھے۔ اور ایران کے مشہور عالموں اور فاضلوں سے حکمت اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد تجارت کی غرض سے ہندوستان تشریف لے آئے اور سندھ میں قیام کیا۔یہاں انہوں نے ابھے چند نام کے ایک ہندو بچے

کو دیکھا اور اسے دیکھ کر اپنے مال و متاع، حکمت و فلسفہ اور عقل و تمیز کو کھو بیٹھے اور ترک لباس کر کے سنیاسی بن بیٹھے اور اس لڑکے کو اپنا مرید بنا کر اپنی تحویل میں لے لیا۔

سرمد دراصل دبستان مذاہب کے پیروکار تھے۔ دبستان مذاہب عبادت کے اس طریقے کو کہتے ہیں جس میں دنیا کے سارے مذہبوں میں یقین رکھ کر ہر ایک مذہب کے طریقے پر خدا کی بندگی کی جاتی ہے۔ چونکہ دارا شکوہ سرمد کے پیروکار اور عقیدت مند تھے اس لئے انہوں نے ہمیشہ ان کے باطل نظریئے کی حمایت کی۔ لیکن جب 1658ئ میں اورنگ زیب عالمگیر تخت نشین ہوئے اور انہوں نے ملکی معاملات کو شریعت کے مطابق ترتیب دینا شروع کیا۔ ان کے نزدیک سرمد کی برہنگی(ننگاپن) خلاف شرع اور لایق تعزیر تھی۔ تو انہوں نے علما سے کہا کہ سرمد سے کلمہ طیبہ پڑھوایا جائے۔ تو انہوں نے لااِلٰہ سے آگے کچھ نہ پڑا۔ اس پر جب علما نے اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ ابھی تک میں لا الٰہ کوئی خدا نہیں یعنی خدا کے نفی کا معنی سمجھنے میں مشغول ہوں جب نفی کا معنی سمجھوں تو پھر اثبات یعنی سبوت میں اِلا اللہ بھی پڑھوں۔ علما نے فتویٰ دیا کہ صرف لا اِلٰہ کہنا کفر ہے۔اس لئے انہیں واجب القتل قرار دیا گیا۔ لیکن سرمد اپنے عقیدے پر ڈٹ گئے اور الا للہ پڑھنے سے انکار کیا تو انہیں خلاف شریعت عقدہ رکھنے کی پاداش میں قتل کردیا گیا۔

دبستان مذاہب کی اصلیت

دبستان مذاہب شیخ سرمد کی تصنیف ہے جو معرکۃ الآرا، اختلاف رائے تصنیف ہے۔ یہ تصنیف ذات باری تعالیٰ کے متعلق مصنف کی اپنے خیالات کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے خیالات کے تیر چلا دئے ہیں۔ وہ مذہبی معاملات میں صُلحِ کُل ہرمذہب کے ماننے والے۔ آزاد خیال آدمی تھے۔ انہیں دوسروں کے عقائید اور اطوار جاننے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے دبستان مذاہب میں ایشا کے تمام مَروجہ اور عقائد جمع کئے لیکن اس میں انہوں نے زیادہ تر پارسی مذہب کے عقائد شامل کردئے ہیں۔ ایک باب میں ایسے متفرق فرقوں کے حالات بھی درج ہیں جن کا نہ ہندو مذہب سے اور نہ اسلام سے کوئی تعلق ہے۔ جن کے عقائید دیکھنے سے ذہن میں خیال آتا ہے کہ جس دور میں انہوں نے اپنے اس نئے مذہب کا آغاز کیا اس دور کے لوگ زیادہ تر خوش اعتقاد اور صوفی خیالات کے تھے۔ ان لی اس تصنیف میں عیسائی، یہودی، بدھ مت اور مسلمانوں کے دونوں فرقے شیعہ و سنی، صادقیہ (مسلمہ لذاب کی پیروی کرنے والے) واحدیہ اور روشنیہ (دین الٰہی کی پیروی کرنے والے) کے خیالات درج ہیں۔ دین الٰہی کے واقعات بدایونی کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں۔ ان مذہبوں اور فرقوں میں ایک خیالی مباحثہ ہے جو مصنف کے خیالات پر مبنی ان کی اپنی تخلیق ہے۔ اس مباحثے میں شیعہ سنی، یہودی، نصرانی اور ہندو عقائید پر سخت اعتراضات کئے گئے ہیں۔ جن سے سب مُتَشدِّ اوّل (خیالات میں تبدیلی لانے والے) مذاہب کے ترجمان لاجواب ہوجاتے ہیں اور حکمت و فلسفہ کے عقلی دلائل دینے والوں پر بھی غالب ہوجاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دبستان مذاہب کے مصنف کسی مذہب سے وابستہ نہ تھے۔ بلکہ صرف ایک آزاد خیال صوفی تھے۔ جنہوں نے اپنی دلیل سے قرآن اور احادیث کی تاویل کرکے انہیں عقائید حکما (دانا اور عقلمند لوگوں کے عقائد) کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخری بات میں چند ایسے بزرگوں کے حالات پر تبصرہ کیا گیا ہے جن سے مصنف کی ملاقات ہوئی تھی جس میں دارا شکوہ کے مرشد ملا شاہ بدخشی کا ذکر ہے۔ جس میں دارا شکوہ کو حضرت معین الدین محمد اور خداوند مکان و مکین اور صاحب زمان و زمین کا خطاب دیا گیا ہے۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی

شیخ محب اللہ ظاہری و باطنی علوم کے جامع (جمع کرنے والے) تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس ظاہری اور باطنی علوم کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ تصوف میں وہ شیخ محی الدین ابن العربی کے ہم خیال تھے دارا شکوہ ان کے بڑے مداحین (تعریف کرنے والوں) میں شامل تھے۔ ایک مرتبہ دارا شکوہ نے ان سے عہد اکبری کا ایک مسئلہ پوچھا کہ آیا حکومت کو تمام رعایا کا مساوی خیال رکھنا چاہیے یا مومن اور کافر میں تمیز کرنا چاہیئے۔ تو انہوں نے جواب میں قرآن کی یہ آیات پیش کی وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ اے نبی ہم نے آپؑ کو تمام دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

شہزادہ دارا شکوہ

عہد شاہجہانی میں آزاد خیال صوفیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ جن میں دارا شکوہ کی بڑی اہمیت تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ بادشاہ کے بیٹے تھے بلکہ اس لئے بھی کہ ان کا علمی مرتبہ بلند تھا اور ان کی تصانیف میں عام صوفیوں کی تصانیف کی بھول بھلیاں نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ شاہجہان کے بڑے بیٹے تھے۔ اس لئے بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے بادشاہ انہیں ترجیح دے کر بغیر خانہ جنگی کے تخت و تاج کے وارث بنانا چاہتے تھے۔ ان کے مرتبے اور منصبے بھی ان کے بھائیوں سے بلند تھے اور وہ انہیں دور دراز صوبوں میں بھیجنے کے بجائے زیادہ تر اپنے پاس دار الخلافہ میں ہی رکھتے تھے۔ شاہجہان کی یہ کورانہ (اندھوں کی طرح) محبت دارا شکوہ کو دنیاوی لحاظ سے بہت مہنگی پڑی۔ کیونکہ ایک تو وہ اس لاڈ پیار سے زیادہ خود سر اور ضدی ہوگیا اور دوسرا اسے عملی نظم و نسق کا وہ سلیقہ حاصل نہ ہوا جو اورنگ زیب کو گجرات دکن اور دوسرے علاقوں کی صوبیداری میں حاصل ہوا۔

دارا شکوہ کی روحانی نشو ونما اَس دن سے شروع ہوئی جب شاہجہان انہیں ایک صوفی بزرگ میاں میر کے پاس صحت یابی کی دعا کے لئے لے گئے۔ صحت یابی کے بعد دارا شکوہ کی عقیدت اہل اللہ (بزرگان دین) سے بڑھ گئی اور پھر وہ حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عقیدت مندی کی یہ حالت تھی کہ وہ حضرت کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں حضرت کا قیام تھا ننگے پاؤں پہنچ گئے اور ان

کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ پیر صاحب نے دارا کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا کی اور غائبانہ مشاہدہ اور مراقبہ (گردن جھکا کر سب چیزوں کو چھوڑ کر) گیان دھیان کیا تاکہ دارا اپنی زندگی میں کامیاب رہے۔

دارا شکوہ اپنے دور کی مرُوجہ (رائج اور روایتی) تعلیم سے آراستہ تھے۔ ان کی پہلی تصنیف سفینۃ الاولیا (اولیا کی کشتی) یعنی اولیا کرام کی سوانح ہے جس میں دنیائے اسلام کے چار سو گیارہ بزرگان دین کے مختصر حالات زندگی ہیں۔ اس کتاب میں دارا نے اپنے آپ کو حنفی مسلک سے وابستہ قرار دیا ہے۔ اس میں حضرت مجدد الف ثانی کے علاوہ ہندوستانی مشائخ کا ذکر ہے۔ حضرت میاں میر ملا شاہ بدخشی کا تذکرہ بھی اس کتاب میں ہے۔ دارا کے روحانی تجسس نے ایک اور کروٹ لی کہ انہوں نے وحدت الوجود کا نظریہ اختیار کرکے دوسرے مذاہب جیسے ہندو ویدانت کو بھی اپنے دل میں بسالیا اور مجمع الجرین کے نام کی ایک کتاب مرتب کی جو مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے عقائید کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس کا نام مجمع الجرین (دو سمندروں یا دریاؤں کے ملنے کی جگہ) یعنی یہ کتاب ہندو یوگیوں اور مسلمان صوفیوں کے عقائید کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس کا نام مجمع الجرین رکھا گیا ہے۔ اس میں صفات الٰہی، نبوت ولایت اور عالم برزخ وغیرہ کے متعلق تصوف اور یوگ کے خیالات جمع کئے گئے اور انہیں ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا گیا۔ عہد عالمگیری میں اسی رسالے کی تالیف پر دارا شکوہ کو ملحد اور واجب القتل قرار دیا گیا۔

دارا شکوہ نے ویدانتیوں کے خیالات کو فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اس سلسلے میں دارا شکوہ کے میر منشی (ہیڈ کلرک) چندر بھان نے ایک رسالہ ''مکالمہ دارا شکوہ اور بابا لال'' کے نام سے مرتب کیا جس میں دارا شکوہ کے سوالات اور بابا لال کے جواب جمع ہیں ۔ شائع کی اس کے علاوہ انہوں نے پنڈتوں کی مدد سے اُپنیشدوں (ہندوؤں کی مذہبی کتابیں جن میں ویدوں کا انتخاب درج ہے) کا فارسی ترجمہ کیا اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بھگوت گیتا کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا اور اس طرح دارا شکوہ مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کی اس جماعت کا سرگروہ بن گئے جو تصوف اور ویدانیت کا مجموعہ تھی اور جس میں دونوں قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائید اور نظریات کو جمع کیا گیا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں اکبر کی مذہبی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ لیکن دارا کی اس روحانی مفاہمت نے ان کا دروازہ دوبارہ کھول دیا۔ شاہجہان ہندو سنیاسیوں کے قائل نہ تھے لیکن ان کے بیٹے دارا شکوہ نے ان ہندو سنیاسیوں کی بڑی خدمت کی۔ انہوں نے سرمد جیسے دبستان مذاہب کے مصنف اور دوسرے کئی آزاد خیال لوگوں کو ان مذہبوں کے گٹھ جوڑ میں شامل کردیا اور اس طرح آزاد خیال کے کئی مسلمان بھی اس میں داخل ہوگئے۔ دارا شکوہ کے ہندو منشیوں (کارگزاروں) سے یہ بات ثابت ہے کہ انہوں نے دنیائی مصیبتوں اور مشکلوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ترک دنیا کا رستہ اختیار کیا تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس اُمشترکہ مذہبی اتحاد کا سنسکرت زبان میں ترجمہ کیا گیا اور کئی دوسری صوفیانہ کتابوں کا بھی اسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ سلطان مشایخ کی وفات کے ساتھ ہی دہلی میں صوفیہ کا عہد ذرین ختم ہوگیا اور تصوف کو شریعت کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ علوم اسلامی کو اب دوبارہ فروغ ہورہا تھا۔ شیخ عبدالوہاب منتقی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور مجدد الف ثانی جس طرح تصوف کو تمام غیر اسلامی اور غیر شرعی عناصر سے پاک کرنے کی کوشش کررہے تھے اور حضرت مجدد نے ایک ہندو کو رام اور رحیم کے ایک کہنے پر دھتکار دیا تھا اور ہندو مذہب کی تحریک جو جارحانہ صورت اختیار کرگئی تھی ناکام ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مسلمان علما اور اہل فکر کسی غیر اسلامی عنصر کو برداشت نہ کرتے تھے۔ بلکہ دارا شکوہ کے خلافِ، شریعت رجحانات کی مخالفت کرتے تھے اور اس طرح دارا شکوہ اور ان کے حامیوں کے ہندو مسلم مذہبی اتحاد کو مسترد کیا گیا۔

دارا شکوہ کو اپنے باپ شاہجہان کی محبت اور ہمدردی بھی مہنگی پڑی۔ کیونکہ باپ کی نظروں میں وہ تاج و تخت کے دعویدار تھے۔ ان کے بھائی مراد، شجاع اور اونگ زیب ان کے حریف تھے۔ وہ سب چاہتے تھے کہ دارا شکوہ کو برائیوں کا مجسمہ ثابت کریں۔ حالانکہ اورنگ زیب کو دارا سے اصولی اختلافات تھے۔ لیکن مراد جیسے شرابی اور رنگیلے انسان نے بھی دارا پر بے دینی کا الزام لگادیا اور انہیں ملحد (بے دین) اور دشمن دین کے ناموں سے نوازا۔ حالانکہ دارا کے ہم خیال اسے محی الدین یعنی دین کی حفاظت کرنے والا کہتے تھے۔ لیکن مسلمان انہیں ہندو یوگیوں اور سادھوؤں میں شمار کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان امرأ اور علما نے اسے ملحد قرار دیا اور انہیں اس بات کی تشویش ہوئی کہ اگر دارا شکوہ بادشاہ بنا تو اکبر کے دین الٰہی کی مذہبی بے قاعدگیاں ہندوستان میں پھر سے عام ہوجائیں گی۔

شاہجہان کے تعمیراتی کام

شاہجہان شاہی تعمیرات کے بڑے شوقین تھے۔ انہونے اپنے دور حکومت میں تعمیرات کے کئی بڑے کارنامے انجام دیئے جن میں آگرہ کا تاج محل، موتی مسجد، شیش محل، جامع مسجد دہلی، دیوان خاص اور رنگ محل، شالیمار باغ لاہور، شاہ جہاں آباد شہر، لال قلعہ، تخت طاؤس وغیرہ ۔ ان تعمیرات پر شاہجہان نے زرِ کثیر خرچ کیا اور اکثر تعمیرات کے لئے باہر سے کاری منگوائے گئے۔تاج محل تعمیر کرنے میں برطانیہ سے کاری گر لائے گئے کہا جاتا ہے کہ اس کے کاریگر اعلیٰ Chief Architecture کی آنکھیں نکالی گئیں تاکہ وہ اس طرح کی کوئی اور عمارت تعمیر نہ کرسکے یہ بات صحیح ہے یا غلط ہمیں نہیں معلوم لیکن عام لوگوں میں اس کا چرچا ہے۔ واللہ اعلم۔

مغل تعمیرات

بابر: قابلی گڑھ، سانبھل کی مساجد

ہمایوں: جامع مسجد دہلی اور عیسیٰ خان مسجد، گنبد ہمایوں وغیرہ

اکبر: آگرہ کا لال قلعہ، جہانگیر محل آگرہ، فتح پوری سیکری، گوندا مندر، دیوان

خاص وغیرہ

جہانگیر: موتی مسجد لاہور، شادرا کا مقبرہ اپنے لئے، آگرہ میں سنگ مرمر کا گنبد

شاہجہان: آگرہ کا تاج محل، موتی مسجد، شیش محل، جامع مسجد دہلی، دیوان خاص

رنگ محل، شالیمار باغ لاہور، شاہجہان آباد، لال قلعہ، تخت طاؤس وغیرہ

اورنگ زیب: دہلی کی موتی مسجد، بی بی کا مقبرہ، لاہور کی بادشاہی مسجد وغیرہ

اورنگ زیب کا دور حکومت اور شریعت کا عروج

اورنگ زیب شاہجہان کے تیسرے بیٹے تھے۔ دارا شکوہ اور شجاع عمر میں ان سے بڑے تھے۔ لیکن قابلیت اور کردار میں انہیں سب بھائیوں پر فضیلت اور برتری تھی۔ وہ محنتی دور اندیش اور بہادر آدمی تھے۔ انہوں نے ملک کے دور دراز علاقوں میں بحیثیت صوبیدار کا کام کیا تھا اور انہیں حکومت چلانے کا بہت بڑا تجربہ ہو چکا تھا اور وہ ایک باتدبیر جرنیل اور بہادر سپاہی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شہزادگی پھولوں کی سیج (بچھونا) نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہے اور اپنے وجود اور اثر و رسوخ کو قائم رکھنے کے لئے ملک کی سیاست پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ وہ ٹھنڈے مزاج اور محتاط طبیعت کے آدمی تھے۔ ضرورت کے وقت اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے تھے اور ایسی تدبیریں سوچ لیتے جو مقصد حاصل کرنے کے کام آسکتی تھیں۔ شاہجہان دارا شکوہ کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے اورنگ زیب کے کاموں میں روڑے اٹکاتے تھے۔ وہ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر اورنگ زیب سے باز پرس کرتے تھے اور ان کے قابل تعریف کارناموں کو نظر انداز کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود شاہجہان اور اورنگ زیب کے باہمی اختلافات زیادہ سخت اور سنجیدہ نہ تھے کیونکہ ان اختلافات میں باپ اور بیٹے کا صَلبی (نسلی) رشتہ حائل تھا۔ جس کی وجہ سے اَن کے اختلافات دور ہو سکتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے اختلافات شدید تھے کیونکہ وہ دونوں اپنے باپ کی وراثت کے مساوی حقدار تھے اور باپ بیٹے کی طرح اپنے اختلافات بھلا نہیں سکتے تھے۔ وہ دونوں تخت وتاج کے دعویدار تھے۔ اس لئے اگرچہ وہ دونوں بھائی بھائی تھے لیکن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بھی تھے اور پھر ان کے درمیان نہ صرف ذاتی اختلاف تھا بلکہ ان کے درمیان خیالات، عقائد اور طور طریقوں کا اختلاف بھی تھا۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب دونوں مذہب میں دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن ان کے مذہب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دارا شکوہ آزاد خیال صوفیوں کے پیرو (تقلید کرنے والے) تھے۔ لیکن اورنگ زیب شریعت کے پابند تھے۔ دارا شکوہ ہندوؤں کی مجلسوں میں شوق و ذوق سے شریک ہوتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب دینی محفلوں میں دینی علوم اور دینی تربیت حاصل کرنے کے لئے شرکت کرتے تھے۔ اس طرح وہ دونوں دو مخالف نظریوں کے پیروکار تھے۔

اورنگ زیب اپنے بھائیوں کی نسبت زندگی کے ہر میدان میں آگے تھے۔ انہوں نے اپنی بہادری کا ثبوت چودہ برس کی عمر میں دیا تھا۔ جب وہ ایک مست ہاتھی کے سامنے کھلے میدان میں ڈٹ گئے۔ دوسرا قابل ذکر واقعہ اس وقت پیش آیا جب بلخ کی مہم پر وہ عبدالعزیز بلخی کے خلاف معرکہ آرا تھے کہ جب دونوں لشکر آپس میں لڑ رہے تھے کہ نماز ظہر کا وقت آگیا تو انہوں نے میدان جنگ میں باجماعت نماز ادا کی تو ان کے مدمقابل پر ان کی جرأت کا اتنا اثر پڑا کہ انہوں نے صلح کی درخواست کی۔ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی قابلیت اور بہادری کا جنگی امتحان تخت نشینی کے جنگ کے دوران بھی ہوا۔ جب دونوں فوجیں جنگ لڑ رہی تھیں تو دارا کے ہاتھی پر حملہ ہوا تو وہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوئے فوج نے سمجھا کہ شہزادہ مارا گیا اس لئے وہ بکھر گئی۔ ایک موقعہ پر اورنگ زیب کو بھی ایسی ہی صورت حال پیش آئی تھی جب وہ ہاتھی پر سوار شجاع کے خلاف لڑ رہے تھے کہ ایک مست جنگی ہاتھی نے ان پر حملہ کیا۔ اس موقعے پر اگر بادشاہ کا ہاتھی بھاگ جاتا تو ساری فوج تِتر بِتُر ہوجاتی۔ لیکن اورنگ زیب نے اپنی جرأت کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ وہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور اپنے ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیا ڈالوادیں تاکہ وہ کہیں بھاگ نہ جائے اور فوج میں افراتفری نہ پھیل جائے۔ اس طرح دارا اور اورنگ زیب کے اوصاف میں زمین و آسمان کا کا فرق تھا۔ دارا اپنے مفادات کے لئے جنگ لڑرہے تھے جبکہ اورنگ زیب سنت الٰہی کے مطابق خدا کی رضا کے لئے میدان جنگ میں کود پڑے تھے۔ اس لئے وہ کامیاب ہوکر ہندوستان کی حکومت پر قابض ہوگئے۔

اصلاحات عالمگیری

اکبر بادشاہ سے لے کر شاہجہان کے عہد حکومت تک ملک بد اخلاقی، توہم پرستی اور اِلحاد سے رنگا ہوا تھا اور اس رنگین دنیا میں اورنگ زیب نے اپنی آنکھیں کھولیں اور جب وہ بادشاہ بنے تو انہوں نے اپنی ساری کوششیں ان خرابیوں کو ختم کرنے میں صرف کردیں۔ تخت نشین ہوتے ہی انہوں نے بھنگ کی کاشت کاری پر پابندی لگادی اور چرس تمباکو اور شراب نوشی ممنوع قرار دی۔ جَوا کھیلنا اور دیگر تمام بداخلاق کاموں کو بند کردیا۔ بازاری عورتوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ شادی کرلیں یا ملک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل کرانے کے لئے کارندے مقرر کئے چھوٹے بچوں سے کام کروانے یا انہیں بیچ ڈالنے کے خلاف احکام جاری کئے۔ اپنی پرہیزگاری اور سادگی سے رعایا کے لئے ایک مثال قائم کردی۔ بادشاہوں کے درباروں میں جو گانے بجانے اور موسیقی کا رواج تھا اسے بند کردیا۔ بادشاہ کی سالگرہ منانے کا رواج ختم کیا۔ گزشتہ بادشاہوں کی عیاشیوں اور فضول خرچیوں کو بند کردیا۔ لوگوں پر عائد کئے گئے غیر ضروری ٹیکس معاف کردیئے۔ وہ عالموں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے ملک کے تمام علما کو جمع کر کے فتاویٰ عالمگیری کے نام سے حنفی فقہ کی ضخیم کتاب مرتب کروائی جو آج تک بڑی اہم اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کے مطابق قرآن و سنت کی روشنی میں ملک کے تمام شرعی فیصلے کئے جاتے تھے۔بیت المال کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ اپنی روزی ٹوپیاں بناکر اور قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھ کر کماتے تھے۔

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی وفات

اورنگ زیب عالمگیر نے 21 فروری 1709ئ میں بروز جمعہ نوے سال کی عمر میں.بمقام احمد نگر وفات پائی۔ آپ اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت انہوں نے وصیت کی تھی کہ چار روپے دو آنے جو میں نے ٹوپیاں بناکر کمائے ہیں میرے کفن پر خرچ کی جائیں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن شریف لکھ کر کمائے ہیں غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کئے جائیں اور ان کی تدفین ان کی وصیت کے مطابق نہایت سادگی سے ہوئی۔ ان کی قبر پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی۔ الغرض حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے پورے ہندوستان میں جو شریعت اسلامی کا نظام قائم کیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ ایک دین پسند عظیم الشان حکمران تھے۔ انہوں نے خلافت

راشدہ کی یاد دلائی۔

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ہندوستان کی مغلیہ حکومت کا زوال آنا شروع ہوگیا۔ ان کے بعد ان میں چند شخصیتوں کے نام اور کام مندرجہ ذیل ہیں۔

بہادر شاہ اول 1707 - 1712

بہادر شاہ اول کا اصلی نام معظم شاہ ہے۔ وہ بہادر شاہ کے نام سے مغل سلطنت کے تحت نشین ہوئے۔ شاہ عالم ان کا شاہی نام تھا۔ انہوں نے امن پسند پالیسی اختیار کی اس لئے وہ شاہ بے خبر کہلاتے تھے۔ وہ امن پسند (Pacifist) حکمران تھے۔پیسزم (Pacifism) امن پسندی یہ عقیدہ ہے کہ تشدد اور جنگ ہمیشہ غلط ہوتے ہیں اور اس میں کبھی شامل نہیں ہونا چاہئے۔ انہوں نے گرو گوبند سنگھ اور چتراسل کے ساتھ امن کا معاہدہ کیا اور مروار کے اجیت سنگھ کو اپنی اطاعت میں لایا اور بعد میں اسے مروار کا راجہ بنادیا۔ انہوں نے لوح گڑھ کے باندا بہادر کو شکست دی۔ انہوں نے جزیہ ختم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے وہ گانے بجانے پسند کرتے تھے اور اس کی حمایت کرتے تھے۔

جہاندار شاہ (1712 - 1713)

جہاندار شاہ نے سلسلہ وار بادشاہت کی جنگ (War of succession) ایران کے ایک طاقتور نوبل (Noble) رئیس زلفقارؔ خان کی مدد سے جیت لی۔ وہ پہلے کٹ پتلی (Puppet) مغل بادشاہ تھے جنہوں نے امبرؔ کے جے سنگھ کو مرزآ راجہ کے خطاب (Title) سے نوازا اور اجیت سنگھ کو مہاراجا کا خطاب دیا۔ انہوں نے ہندوؤں کا جزیہ (Tax) ختم کردیا۔

برخ سیار (1713 - 1719)

برخ سیار سید برادرس (Syed Brothers) عبداللہ خان اور حسین خان کی مدد سے تخت نشین ہوئے جو وزیر اور میر بخشی کے عہدوں پر بالترتیب (Respectively) کام کرتے تھے آخر کار فرخ سیار کو سید برادرس کی جاسوسی سے مرہٹوں نے 1719ئ میں قتل کرڈالا۔

محمد شاہ (1719 - 1748)

محمد شاہ نے سید برادرس کی مدد سے ہندوستان کی حکومت سنبھال لی۔ لیکن سید برادرس کو نوابوں کی سازش سے 1720ئ میں قتل کیا گیا۔ اس کے بعد نظام الملک کو وزیر منتخب کیا گیا لیکن وہ 1722ئ میں عہدہ چھوڑ کر دکن چلے گئے اور وہاں حیدر آباد کی آزاد اور خودمختار ریاست کی بنیاد ڈال دی۔ محمد شاہ کی 29 سالہ حکومت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کی حکومت کا عہدہ سنبھال لیا۔

احمد شاہ ابدالی(1748 - 1754)

احمدشاہ ابدالی نے کئی بار دہلی پر حملہ کیا اور آخر میں پنجاب اور ملتان ان کے حوالے کردئے گئے۔ جہاں انہوں نے کئی سال تک حکومت کی۔ انہوں نے مرہٹوں کو پانی پت کی تیسری لڑائی میں شکست دی۔

عالمگیر دوم (1754 - 1759)

احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر دوم کے دور حکومت میں دہلی پر قبضہ کیا۔ انہوں نے مرہٹوں کو پانی پت کی تیسری لڑائی 1761ئ میں شکست دی۔ مرہٹوں کی قیادت شیوراج نے کی۔

شاہ عالم دوم (1759 - 1806)

انہوں نے شجاالدولہ کی حمایت میں بہار کی حکومت کی تاج پوشی کا اعلان کیا۔ لیکن بعد میں انہیں بارہ سال کی جلاوطنی میں رہنا پڑا اور پھر انہوں نے بکسر کی لڑائی لڑی لیکن انہیں دوبارہ شکست ہوئی اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے انہیں کئی سال تک جیل میں رکھا۔ اس طرح ان کی زندگی اکثر جیل خانوں میں گزری اور انہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

اکبر دوم (1806 - 1837)

اکبر دوم نے رام موہن رائے کو راجہ کا خطاب دیا۔ اسی دوران لارڈ ہاسٹنگس (Lord Hostings) نے مغلوں کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ انہوں نے راجاؤں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے پنشن (Pension) مقرر کیا۔

بہادر شاہ ظفر دوم (1837 - 1857)

بہادر شاہ ظفر دوم آخری مغل حکمران تھے۔ انہیں برٹش والوں (Britisher) نے لال قلعہ میں قیدی بنا کر رکھا۔ لیکن 1857ئ کی بغاوت (Revolt) میں انہیں انگریزوں نے رنگون جیل میں قید کردیا جہاں ان کا انتقال ہوگیا اور اس طرح ہندوستان میں مغل سلطنتوں اور بادشاہوں کا خاتمہ ہوگیا ۔ اور برطانیہ کے انگریزوں کا پورے ہندوستان پر قبضہ ہوگیا جو 1947ئ تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ انہوں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے علاحدہ کرکے پاکستان کے نام پر مسلمانوں کے علاحدہ دیش کا اعلان کردیا اور اس طرح دنیا کی سب سے بڑی آبادی والی سلطنت ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اور دنیا میں پاکستان نام کا ایک اور ملک وجود میں آگیا۔

لشمیر میں اسلام کی آمد

عبدالرحمان بلبل شاہ

کشمیر کے عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ کشمیر میں میر سید علی ہمدانی ؒ نے اسلام کا آغاز کیا اور ان کی کوششوں سے وادی کشمیر میں اسلامی انقلاب رونما ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ سے تقریباً پچاس (50) سال پہلے حضرت شیخ شرف الدین عبدالرحمان المعروف بلبل شاہ نے کشمیر میں اسلام کا آغاز کیا۔ کئی سالوں تک آپ کی مسلسل کوشش کے باوجود صرف چند لوگ مسلمان ہوئے لیکن مشیئت اِیزدی (اللہ کی مرضی) سے جب ایک دن یہ بزرگ دریا کے کنارے اس جگہ پر جو بلبل لنکر کے نام سے مشہور ہے۔ نماز ادا کررہے تھے کہ دوسرے کنارے بدھ مت کے پیروکار کشمیر کے بادشاہِ وقت رینچن شاہ اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی (Walk) کررہے تھے کہ اچانک ان کی نظر اس مردمومن پر پڑھی جو نماز پڑھ رہے تھے۔ انہیں آپ کی عبادت کرنے کا یہ طریقہ بہت پسند آیا اور آپ کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ یہ کونسی عبادت ہے تو آپ نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی عبادت ہے جسے نماز کہتے ہیں۔ بادشاہ اپنے مذہب بدھ مت سے مُتنفِر ہو چکے تھے۔ انہوں نے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا اور اپنا نام رینچن شا سے بدل کر صدر الدین رکھا۔ اس طرح کشمیر میں اسلامی سلطنت کا آغاز ہوا اور مسلم بادشاہوں کے زیر سایہ اسلام کی اشاعت کا کام شروع ہوگیا۔

اس واقعہ کے پچاس سال بعد 1372ئ میں میر سید علی ہمدانی کشمیر تشریف لے آئے۔ ایک اسلامی سکالر، دانشور پروفیسر غلام محی الدین حاجنی اپنے ایک مضمون (Article) ''مجلہ شیخ نور الدین نورانی'' میں لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں جو مبلغین اسلام کشمیر آئے۔ انہوں نے کشمیر کے ماحول سے مجبور ہوکر ریشیت اختیار کی ہوگی۔ کشمیر میں اس زمانے میں بدھ مت اور ہندو دھرم کا دور دورہ تھا۔ غار نشینی اور رہبانیت ان مذاہب کے لازمی اجزا رہے ہیں۔ اس لئے ان مبلغین نے بھی یہاں کے لوگوں کا ایک خاص مذہبی مزاج دیکھتے ہوئے ریشیت اختیار کی ہوگی اس طرح کسی تصادم اور ٹکراؤ کے امکانات کی راہیں بند کرکے خاموش طریقے سے اشاعت دین کا کام انجام دیا گیا ہوگا۔ (پروفیسر محی الدین حاجنی)

حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی ؒ

سید علی ہمدانی المعروف امیر کبیر مبلغوں کی ایک بڑی جماعت لے کر کشمیر تشریف لائے اور یہاں کے اکثر لوگوں نے ان کی پر خلوص دعوت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا اور لوگ جوق در جوق ان مبلغین سے بیعت لے کر اسلام قبول کر رہے تھے۔ ایک متعصب برہمن طبقہ اسلام کی مقبولیت سے پریشان تھا۔ مگر اسلام کے آگے جب یہ لوگ مغلوب ہو گئے تو انہوں نے مسلمانوں سے اپنے بغض اور نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیا جس کا اندازہ مورخ جونراج کی تاریخ کی ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ
''جس طرح ہوا درختوں کو اکھاڑتی ہے، ٹڈیاں دھان کی فصل برباد کرتی ہیں اسی طرح باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں نے کشمیر کی ہیئت اور حالت تباہ اور برباد کر کے رکھدی ہے۔''

لیکن حقیقت جونراج کے اس بے وقعت اور بے بنیاد مثال کے برعکس ہے کہ ان مہاجرین نے دراصل کشمیر کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ انہوں نے خلوص نیت اور محنت و مشقت سے کشمیر کو اسلام کا گہوارہ بنایا۔ کشمیر میں جو ذات و پات ، اونچ نیچ اور رنگ و نسل کی بیماری عام تھی۔ انہوں نے اس بیماری کو ختم کر کے مساوات اور بھائی چارہ قائم کیا۔ حضرت سید علی کی قیادت میں لوگ جوق در جوق اسلام میں شامل ہو گئے۔ لوگوں کی اسلام قبول کرنے کی تحریک اس طرح زور و شور سے چل رہی تھی کہ کشمیری پنڈتوں کے اسلام قبول کرنے کی مہم کے دوران ایک واقعہ پیش آیا جو آج تک کشمیری زبان میں بطور کہاوت مشہور ہے کہ ایک پنڈت برہمن کو اپنی برادری کے لوگ اسلام قبول کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دوران گفتگو پنڈت نے کہا کہ اگر ماتھے پر ٹیکہ لگانے کے لئے سندور نہ ملے تو کیا کریں۔ انہوں نے کہا کہ سندور کے بدلے سیاہی (Ink) سے ٹیکہ لگایا جائے۔ پنڈت نے کہا کہ سیاہی نہیں ملی تو کیا کیا جائے۔ انہوں نے کہا تو پھر مٹی سے کام لیا جائے۔ اس نے کہا کہ اگر مٹی بھی نہ ملی تو پھر کیا کریں۔ پنڈتوں نے کہا کہ آپ مسلمان ہونا چاہتے ہو تو ہو جاؤ۔ کشمیری زبان میں آج بھی یہ کہاوت موجود ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کو نہ کرنے کے لئے حیلے بہانے ڈھونڈتا ہے تو اس وقت یہ مثال دی جاتی کہ ''ژِ چھِی غرض مسلمان بَننس''، یعنی تجھے مسلمان بننے کی غرض ہے۔ اس کہاوت سے اس حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

کہ کس طرح لوگ بڑے بڑے گروہوں میں آکر اسلام قبول کر رہے تھے۔

سید علی ہمدانی پہلی بار سلطان شہاب الدین کے عہد سلطنت میں سات سو (700) سادات کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے اور چار مہینے کے قیام کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔ پھر سلطان شہاب الدین کے بھائی سلطان قطب الدین کے دور حکومت میں دوبارہ تشریف لائے اور تقریباً ڈھائی برس کشمیر میں قیام کیا اور پھر براہ لداخ ترکستان روانہ ہوگئے۔ تیسری مرتبہ آپ 1383ئ میں کشمیر تشریف لے آئے اس دفعہ آپ کا ارادہ تھا کہ کافی عرصہ تک کشمیر میں قیام کریں گے۔ لیکن صحت کی خرابی کے باعث مختصر وقت کے بعد ہی واپس تشریف لے گئے اور راستے میں 786ھ مطابق 1384ئ 5ذی الحجہ 72سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔ اللہ انہیں مغفرت فرمائے اور انہیں اسلامی خدمت کے اس کار عظیم کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

یہ بات واضح رہے کہ سید علی ہمدانی؁ شافی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن کشمیر میں آکر انہوں نے جب دیکھا کہ یہاں عبدالرحمان المعروف بلبل شاہ نے حنفی مسلک کی پیروی میں اسلام کی داغ بیل کی ہے تو اپنے مسلک کا اظہار کئے بغیر انہوں نے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ اس بات کا ثبوت اس حقیقت میں موجود ہے کہ کشمیر میں آج بھی حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت موجود ہے کیونکہ اسلام کے بانی کا تعلق حنفی مسلک سے تھا جبکہ اکثر لوگوں کو سید علی ہمدانی؁ کی وساطت سے ہی مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ رہا سوال رفع الدین کرنے والے اہل حدیث لوگوں کا تو یہ غیر مَقلد ہیں یعنی یہ کسی بھی مسلک سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ یہ تحریک 1906ئ میں برصغیر ہند احادیث کی پیروی کی حمایت میں عمل میں آگئی اور اسی وجہ سے یہ لوگ اہل حدیث کہلاتے ہیں۔

کسی کو یہ خیال نہ رہے کہ کشمیر کے محسن اسلام حضرت سید علی ہمدانیؒ کو کشمیر میں اشاعت اسلام کی جدوجہد میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہر دور میں اسلام کی اشاعت کے لیے معلمین اور مبلغینِ اسلام کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اسی طرح آپ کو بھی دین بگاڑنے والے عیاش اَمرا، بد عمل علما اور غلط کار صوفیوں سے واسطہ پڑا۔ اس دور میں اگرچہ علمائے حق اور صلحائے دین کی کوئی کمی نہ تھی تاہم غلط کار علما، صوفیا، قاضی اور مفتی صاحبان اور واعظین حضرات بھی موجود تھے جو معاشرے کے یکساں طور پر ذمے دار تھے اور یہ لوگ علما حق اور دین کے مخلص خادموں کی راہ میں کانٹے بچھانے میں پیش پیش ہوتے تھے۔ اور یہ دنیا پرست علما کسی امیر یا حاکم کے ساتھ وابستہ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انجام دینے کے بجائے نفسانی خواہشات کے لئے مجرموں کی بے جا حمایت کر کے اپنے مقام و منصب کو ذلیل کرتے تھے۔ سید ہمدانی اپنی معروف و مشہور کتاب ذخیرۃ الملوک میں کئی جگہوں پر اس طبقے کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک جگہ پر آپ لکھتے ہیں کہ اکثر علما غفلت اور بے حسی کی وادی میں صحیح راستہ کھو چکے ہیں۔ ان کی لگام ان کی خواہشات نفس کی قابو میں ہے کینہ اور بغض نے ان کے دلوں کو سیاہ کیا ہے اور حرص وہوس نے ان کے باطن کو تاریک کیا ہے۔ یہ لوگ دنیاوی مال و اسباب کو اپنی زندگی کا مقصود و مدعا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے رسمی علوم کو شہرت اور ناموری کا ذریعہ بنایا ہے یہ لوگ دوسروں کی کیا رہنمائی کر سکتے ہیں جبکہ یہ خود دوسری کی اصلاح اور نصیحت و رہنمائی کے محتاج ہیں۔ اس کینہ پروری اور بغض و عناد کا عالَم یہ تھا کہ آپ جیسے عالم، متقی اور خدا دوست بھی ایک مرتبہ ان کی فریب کاری کا نشانہ بن گئے۔ جب ان لوگوں نے آپؒ کو زہر کھلا کر جان سے مارنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاکت سے بچا لیا۔ حالانکہ زہر کا اثر کئی سال تک ان کے جسم میں باقی رہا۔ لیکن اللہ نے اپنے فضل و کرم سے دشمنوں کی اس سازش کو ناکام کر دیا۔ آپؒ نے اَس عہد کے بعض غلط کار واعظوں اور جاہل صوفیوں کی شکایت بھی کی۔ ان کی نگاہوں میں یہ لوگ قرآن و حدیث اور علما دین کے کارناموں سے ناواقف تھے۔ ان کا تبلیغ قصہ خوانی اور داستان سرائی تک محدود ہے جس کے نتیجے میں یہ لوگ قرآن و حدیث اور علمائے دین کے کارناموں سے ناواقف ہیں اور دین کے صحیح فہم و فراست سے خالی ہیں۔ بحوالہ ذخیرۃ الملوک

میر سید محمد ہمدانیؒ

حضرت سید محمد ہمدانیؒ تین سو علما اور مبلغین کے ہمراہ اپنے والد محترم کے مشن (Mission) کو پورا کرنے کے لئے کشمیر تشریف لائے۔ اس وقت ان کی عمر بائیس(22) سال کی بتائی جاتی ہے لیکن کم عمری کے باوجود ان کی شخصیت نہایت دل آویز اور پر رونق تھی۔ وہ بااثر اور باوقار عالم کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ جس کا اعتراف جونراج جیسے مُتعصب (تعصب کرنے والے) مورخ بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ مہاجر مسلماوں سے نفرت کرتے تھے وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

اردو ترجمہ: کشمیر آنے والے مسلمانوں میں میر محمد ہمدانی ایسے ممتاز اور نمایاں ہیں جیسے تاروں میں چاند ہے۔

یہ زمانہ سلطان قطب الدین کے بیٹے سلطان سکندر کے عہد حکومت کا تھا۔ انہوں نے محمد ہمدانی اور ان کے ساتھیوں کا والہانہ استقبال کیا۔ اس وقت کشمیر میں ریشیانِ کشمیر کے نام سے درویشوں کی ایک جماعت موجود تھی جو سماج سے ہٹ کر غاروں اور پوشیدہ جگھوں پر ایک علاحدہ دنیا میں تپسیا (جسم کو اذیت دینے والی عبادت) میں مشغول رہتے تھے۔ وہ بھی اسلامی انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور تحریک اسلام میں شامل ہوگئے اسی دوران شیخ نور ادین ولی جو کشمیر کے ریشیوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ میر سید محمد ہمدانی سے بیعت لینے کے لئے آگے بڑھے اور کاروان داعیان اسلام (اسلام کی دعوت دینے والوں کے کاروان) میں شامل ہوگئے۔

کشمیر میں داخل ہوتے ہی لوگوں نے میر سید محمد ہمدانیؒ کا اس طرح والہانہ استقبال کیا کہ جیسے وہ مدت دراز سے کسی مطلوبہ ہستی کے منتظر (انتظار کرنے والے) تھے۔ اس مخلصانہ اور جذباتی انداز کے استقبال کے پیش نظر کشمیر کے حکمران آسانی سے آپ کو حکومت میں شامل کرسکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چل کر بے نیازی سے اپنی ساری سرگرمیاں تبلیغ دین اور اصلاح

معاشرہ کے لئے وقف کردیں اور سیاسی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کی۔ آپ ؒ نے اپنے سینکڑوں رفقا کو تبلیغ دین کے لئے مقرر کیا اور کشمیر میں شاید ہی کوئی گوشہ اسلام کی روشنی سے محروم رہا ہوگا۔

ر

حضرت میر سید علی ہمدانی کا ایک نمایا ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کشمیر میں ریشیت کی اصلاح کی اور ریشی صاحبان کو اسلام سے روشناس کردیا۔ چونکہ کشمیر میں ان ریشیوں کی بڑی اہمیت تھی۔ کشمیر میں اسلام آنے سے قبل ان کا تعلق بدھ مت اور ہندو دھرم سے رہا تھا جب میر سید محمد ہمدانیؒ اپنے سینکڑوں رفقا کے ساتھ یہاں تشریف لائے تو ان کی پرجوش دعوت سے ہندو دھرم اور بدھ دھرم کے یہ ریشی لوگ بے حد متاثر ہوئے۔یہاں تک کہ ریشی سلسلہ کی ایک نامور شخصیت شیخ نور الدینؒ نے ان سے بیعت لی اور ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد کشمیر کے یہ برہمن ریشی لوگ سارے کے سارے اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان ریشیوں سے مخلصانہ رابطہ کرکے میر سید محمد ہمدانیؒ اور ان کے رفقا نے اشاعت اسلام میں ایک بڑا کارنامہ انجام دیا کہ انہوں نے ریشی صاحبان کو غار نشینی اور فاقہ کشی کی زندگی سے نکال کر تبلیغ اسلام اور تزکیہ نفس کی زندگی گزارنے کے میدان میں اتارا جنہوں نے پہاڑوں، بیابانوں اور جنگلوں میں رہنے والوں تک اسلام پہنچانے کی سعادت حاصل کی۔

میر سید محمد ہمدانیؒ ایک ذہین عالم دین اور مخلص مبلغ تھے۔ انہوں نے کشمیر میں اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کے لئے یہاں کے لوگوں کی مادری زبان کو ترجیح دی اور شیخ نور الدینؒ نے کشمیری زبان میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ان کی کشمیری رباعیات نے یہاں کے ہزاروں نو مسلموں کو اسلام کی تعلیم سے روشناس کیا۔ کشمیری زبان کے ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کا منظوم کشمیری کلام کشمیریوں کے لئے دینیات سے کم نہ تھا۔ ان کا کلام آج بھی کشمیر میں لوگوں کی زبان پر جاری ہے اور وقتاً فوقتاً اس کلام کو کشمیری محفلوں میں پڑھا جاتا ہے۔ لیکن آج کل کشمیر کی نئی نسل اپنی مادری زبان سے محروم ہوتے نظر آرہی ہے۔ اس لئے اس زبان کے ناپید ہونے کا قوی احتمال ہے۔ کیونکہ اس زبان سے محبت کرنے والے ادیب، قلم کار اور شعرا حضرات کی اولاد بھی اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر دوسری زبانوں خاص طور انگریزی زبان کے دلدادہ بن گئے ہیں۔ اس لئے کشمیری زبان کے مستقبل کا کوئی روشن پہلا نظر نہیں آرہا ہے۔یہاں تک کہ اس زبان کا نام و نشان مٹ جانے کا اندیشہ ظاہر ہورہا ہے۔ (واللہ اعلم)

میر سید محمد ہمدانیؒ اپنے والد میر سید علی ہمدانیؒ کی طرح فصیح و بلیغ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مصنف بھی تھے۔ وہ دینی علوم سے پوری طرح آراستہ تھے۔ کشمیر کے اس وقت کے بادشاہ سلطان سکندر کشمیر آئے ہوئے ان علما کے قدردان تھے۔ لہٰذا یہ علما کرام سلطان کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح کئی علما کرام نے اپنی تالیفات اور تصنیفات کے ذریعے ان تک رسائی حاصل کی۔

کشمیر میں ریشیوں کی اصلیت

کشمیر کے ریشیوں کی تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق ہندو مذہب اور بدھ مذہب سے تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے دنیا کی نصف آبادی سے زیادہ لوگ ان ہی دو مذاہب سے تعلق رکھتی تھی اور یہ لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے چین اور برصغیر ہندو موجودہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگ ان ہی بت پرستوں کی نسل ہے اور عرب ممالک کے لوگ بھی اس طرح کی بت پرستش کرتے تھے۔ ان ہی بت پرستوں میں ریشیوں کا ایک فرقہ تھا جو مراقبہ کرکے یعنی گردن جھکا کر اپنے حواس کو بے کار کرکے عبادت کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جتنا وہ اپنے آپ کو دنیائی آلودگی اور مادیت سے الگ رکھیں اتنا وہ خدا کے مقبول اور پیارے ہوں گے۔ یہ لوگ گوشت اور انڈے وغیرہ یہ سمجھ کر نہیں کھاتے تھے کہ کسی جاندار کو مارنا ایشور کے نزدیک جرم عظیم ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بیوی بچوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کرتے تھے۔ یہ اکثر پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنی زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔

شیخ نور الدینؒ کی تبلیغی خدمات

جب حضرت شیخ نور الدینؒ المعروف نندہ ریشی اسلام کی دولت سے سرفراز ہوئے تو انہوں نے لوگوں کی اصلاح کرکے انہیں پوری طرح اسلام کے دائرے میں لایا ان کی پاکیزہ اور سادہ زندگی نے سماج کے اوباشوں (آوارہ لوگوں) اور مذہب کا استحصال کرنے والوں سے لوگوں کو نجات دلائی۔ اسلام میں داخل ہوکر یہ لوگ اب اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ خلوص محبت، سادگی اور خدمت خلق کا درس دیتے تھے اور لوگوں کو کامیابی کے ساتھ اسلام کی طرف راغب کرتے تھے۔ دراصل اسلام کے مبلغین کو ان مقامی ریشیوں کی سادہ زندگی سے اسلامی مشن کو آگے بڑھانے اور لوگوں کے دلوں میں اتارنے میں بڑی مدد ملی۔ ان کی قناعت شعاری، پرہیزگاری، دنیا سے بے نیازی، سادہ زندگی، خدمت خلق اور حرص و ہوس سے دوری جیسے اوصاف سے تبلیغ کے کام میں بڑی آسانی ہوئی کیونکہ ان ریشیوں نے اسلام کی تبلیغ کے میدان میں دل و جان سے حصہ لیا۔ اس طرح ان ریشیوں کا تعاون حاصل کرکے مہاجر مبلغوں کی دشواری میں آسانی ہوئی۔

ریشیوں کے تبلیغی کام

شیخ نور الدینؒ اپنی مادری زبان کے جلیل القدر شاعر اور اسلام کے شیرین زبان مَبلغ تھے۔ انہوں نے نہایت مؤثر انداز میں گوشہ نشینی اور غاروں گھپوں میں عبادت کرنے کی سخت مذمت کی۔ کشمیری میں ان کا ایک مشہور شعر ہے:

اردو ترجمہ: اگر خدا کو غاروں اور گھپوں میں ذکر کرنا قبول ہوتا تو پھر غاروں اور گھپوں (اندھیروں) میں رہنے والے گیدڑ اور نیولے (Jackals and Mongoose) عبادت کے لئے کافی تھے۔

اس طرح انہوں نے غار نشینی اور تکلیف دہ عبادت سے دور رہنے کی تلقین کی جس سے ریشیوں کی طرز زندگی اور طریقہ عبادت کا حَلیہ بدل گیا۔ حضرت شیخ نور الدینؒ نے اپنی شاعری سے نہ صرف قدیم ریشیت کی بے اعتدالی اور مضر اثرات کی نشاندہی کی بلکہ اسلام اور اس کے عقائد، عبادات اور اخلاقیات کی تبلیغ ایسے پر اثر طریقے سے شروع کی کہ کوئی کشمیری ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری

سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا ہو اور ان کے بارے میں علما وقت کو یہ کہنا پڑا کہ ان کی شاعری کشمیری زبان میں لکھی ہوئی پہلی دینیات ہے۔ مغلیہ دور کے ایک سرکردہ عالم بابا نصیب الدین غازیؒ نے ان کے کلام کا ذکر یوں کیا کہ ان کے اشعار اور ان کا کلام شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کے عین مطابق ہے۔

حضرت شیخ العالم نور الدینؒ کی پُر خلوص کوششوں سے ریشیان کرام نے اسلام کی تبلیغ میں بھرپور حصہ لیا۔ چونکہ یہ ریشی صاحبان سب کے سب مقامی لوگ تھے۔ انہوں نے باہر سے آئے ہوئے مبلغین کے کندھوں سے کندھے ملاکر تبلیغ اسلام کا کام کیا اور ان مقامی ریشیوں کے تعاون سے مہاجر مبلغوں کی دشواریاں حل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ جن ریشی بزرگوں نے اشاعت اسلام کی تحریک میں حصّہ لیا ان میں سے چند حضرات کے نام گرامی یہ ہیں:

بابا نور الدینؒ، باباپیام الدینؒ، بابا بام الدینؒ، بابا زین الدینؒ، بابا نصرالدینؒ، باباتاج الدینؒ، بابا قوام الدینؒ ، بابا ضیائ الدینؒ، باب شریف الدینؒ، بابا نوریؒ اور بابا سنگیؒ

یہ سب حضرات ریشی لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول کرکے باہر سے آئے ہوئے مبلغین کے ساتھ اشاعت اسلام کے لئے کام کیا۔

صوفی مبلغین کی تبلیغی خدمات

تصوف:

خدا کی طرف دھیان لگانے اور تزکیہ نفس کرنے کو تصوف کہتے ہیں۔

صوفی:

خدا کی طرف دھیان دے کر عبادت کرنے والے اور اپنے آپ کو برائیوں سے پاک رکھنے والے کو صوفی کہتے ہیں۔

کشمیر میں اسلام کا ایک روشن پہلو یہ تھا کہ اَمت اسلام کے تمام بوریا نشین (خلوت میں رات دن

عبادت کرنے والے) دین اسلام کی عظیم اور نازک ذمہ داری قبول کرتے ہوئے میدان عمل میں نکل آئے اور دین اسلام کی خدمت کو منطقی (حق کو حق اور ناحق کو ناحق) ثابت کرنے کے انجام تک پہنچانے کے لئے ذوق و شوق سے کام کیا اور اس طرح حق کو ناحق پر غالب کرکے بام عروج پر پہنچادیا۔

حضرت میر سید علی ہمدانی، کی سوانح عمری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمدان میں ولادت پانے والے یہ شخص ہمالیہ کے چوٹیوں کو پار کرکے کشمیر میں اشاعت اسلام کے لئے آئے اور ان کے حبِ اسلام اور تزکیہ نفس کا یہ حال تھا کہ انہوں نے منفی درجہ حرارت (Minus temprature) میں شدید سردی کا مقابلہ کرکے کشمیر میں داخل ہوکر دین اسلام کی خدمت کی اور ان کے ساتھ عام مشائخ اور صوفیائے کرام دین اسلام کی اس خدمت میں شوق و ذوق سے شامل تھے۔ ان ہی اوصاف و کمالات کی بنا پر دنیا کی کوئی طاقت ان کے ارادوں اور تمناؤں کے آگے حائل نہ ہوسکی۔ بلند و بالا پہاڑ، سمندروں کے طوفان اور جنگلوں اور بیابانوں کی دہشت اور وحشت نے ان کے حوصلوں کے آگے سرنڈر (Surrender) کیا۔ انہوں نے ان مشکل حالات میں بھی ان مقامات پر اذانوں کی گونج سے نمازوں کی پیروی کی اور اس طرح دنیا کے اسلامی انقلاب کے ساتھ ساتھ کشمیر میں دین اسلام کا جھنڈا لہرایا۔

کشمیر میں خانقاہوں اور درگاہوں کی حیثیت اور حقیقت

دراصل حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ نے ان باہر سے آئے ہوئے صوفیوں اور مبلغوں کو وادی کے طول وعرض میں اسلام کی اشاعت کی ذمہ داری سونپی تھی اور یہ ذمہ داری انہوں نے جوش و جذبہ سے نبھائی۔ اسلام کے یہ مبلغین اور خادم دین جہاں رہائش پذیر ہوتے تھے ان کو خانقاہیں کہتے تھے۔ خانقاہ عربی لفظ ہے جو اردو لفظ خانہ گاہ کا متبادل ہے۔ چونکہ یہ خانقاہیں ان خادمین اسلام کے گھر ہوتے تھے۔ اس لئے جب کسی خادم کا انتقال ہوجاتا تو اسے قبرستان کی عدم موجودگی کی وجہ سے اپنے ہی گھر میں دفن کیا جاتا اور بعد میں ان کے عقیدت مند لوگوں نے ان کے مقبروں اور رہائش گاہوں کو زیارت گاہوں میں تبدیل کیا جو آج تک زیارت گاہوں اور آستانوں کی شکل میں موجود ہیں اور ان کے معتقدین ان کی زیارت کرتے ہیں۔

سلطان سکندر کے دور حکومت میں اسلام کی اشاعت

سلطان قطب الدین ایبک کے بعد ان کے بیٹے سلطان سکندر 1389ئ میں کشمیر کے حکمران بن گئے۔ انہوں نے پچیس (25) سال تک حکومت کی۔ جس طرح ان کے باپ قطب الدین میر سید علی ہمدانی کے گہرے عقیدت مند تھے اسی طرح ان کے بیٹے سلطان سکندر سید علی ہمدانی، کے بیٹے میر محمد ہمدانی، کے حامی اور ہمدرد تھے۔ سلطان سکندر نے مملکت اسلامی کے استحکام کے لئے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی رعایا کے ایک طبقے نے ظاہری اسلام کا لبادہ پہن رکھا تھا اور انہوں نے بادشاہ کی مخالفت کرکے ان کے کارناموں پر پانی پھیر دیا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اسلام لانے سے پہلے ہندو مذہب کے غمخوار بنے تھے اور ذات پات کے شدید ترین معتقد تھے۔ اب ان ہی لوگوں نے اسلام کے روپ میں سلطان سکندر کے خلاف بغاوت شروع کردی۔ جب اس سازش میں یہ ناکام ہوئے تو روپوش ہوکر انہوں نے تاریخ نویسی کا سہارا لے کر واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا شروع کردیا اور اپنی اسلام دشمنی کا اظہار اسلامی تاریخ کے مورخین بن کر کیا۔ ان لوگوں نے سلطان سکندر کو بت شکن یعنی بت توڑنے والے کا خطاب دے کر مسلمانوں کا ہیرو بنادیا اور اسلام کو خون اور تلوار کا مذہب بناکر تاریخ لکھنی شروع کردی اور سلطان سے ایسی داستانیں منسوب لیں جن سے ان کے مذہبی تعصب کا اظہار ہوتا ہے اور اپنی ان داستانوں کو یہ لوگ اصلی اسلام قرار دےتے تھے۔ انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ کشمیر میں اسلام تبلیغ سے نہیں بلکہ تلوار سے پھیلا اور سید علی ہمدانی، اور ان کے فرزند ارجمند میر محمد ہمدارنی، کو اس تحریک کا رہنما قرار دیا۔ جو بالکل ایک غلط پروپگنڈہ (False propaganda) تھا۔ اگر ان کی اس دلیل پر اعتبار کیا جائے تو پھر کشمیر میں ایک بھی بت کدہ موجود نہ ہوتا۔ ایک طرف انہوں نے سکندر کو بت شکن قرار دے کر ان کی کردار کشی کی تو دوسری طرف مورخین اسلام ہونے کا دعویٰ کرکے جذبات میں آکر ان کو اسلام کا مطیع اور فاتحہ قرار دے کر اسلام کا ہیرو بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک جنونی ہندو مورخ جونراج نے سکندر کے متعلق اس طرح اپنا بخار اتارا۔

''یہ صرف اہل کشمیر کے گناہوں کا نتیجہ ہے کہ بادشاہ سکندر یؤنون یعنی غیر کشمیری مسلمانوں کی طرف اس طرح راغب ہوا جس طرح بچے کو کیچڑ کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے۔ بہت سے یؤنون (مسلمانوں) نے اپنے ممالک کو چھوڑ کر بادشاہ سکندر کے ہاں اس طرح پناہ لی جس طرح شہد کی مکھیاں پھولوں کو چھوڑ کر ہاتھی پر بیٹھتی ہیں اور جس طرح ہوائیں درختوں کو اکھاڑتی ہیں اور ٹڈیاں شالی کی فصلیں برباد کرتی ہیں اسی طرح ان اجنبیوں (مسلمانوں) نے کشمیر کی ہیئت مسخ کردی اور جس طرح یہ ٹڈیاں اناج کی کھیتوں پر چھا جاتی ہیں اسی طرح ان غیر ملکیوں نے بادشاہ کی فیاضی سے فائدہ اٹھا کر کشمیر میں اپنا جال بچھایا۔ ان ملیچھیوں (مسلمانوں) کے برے اعمال سے مملکت کشمیر گندی ہوگئی''

سکندر کے وزیر اعظم سہہ بٹ ایک ہندو تھے جو نسلی لحاظ سے برہمن تھے اور میر محمد ہمدانی کے ذریعے وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان بن گئے چونکہ وہ وزارت اعظمیٰ کے اہم ترین عہدے پر فائز تھے اس لئے ان کے مسلمان بننے سے ملک کے غیر مسلم متاثر ہوئے بالخصوص چھوت چھات، اونچ نیچ اور ذات پات کی بیماری کے ستائے ہوئے لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں پہل کی۔ چونکہ مورخ جونراج بھی برہمن تھے اس لئے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کردیا اور سہہ بٹ کے متعلق اول فول بکنے لگے کہ سہہ بٹ نے مسلمان ہوکر ویدوں کی کوئی تعظیم نہیں کی۔ انہوں نے مسلمانوں کے اشاروں پر بادشاہ کو اوتاروں کی مورتیاں توڑنے پر آمادہ کیا اور بادشاہ نے اپنے فرائض سے غافل ہوکر ان کو توڑنے کا حکم جاری کیا۔ موجودہ حکمران سکندر نے مسلمانوں کے اکسانے پر مورتیوں کا توڑ پھوڑ کیا۔ وہ مذید لکھتے ہیں کہ ان مورتیوں کو توڑنے سے دنیا ہل گئی مگر ظالم بادشاہ کو جنبش تک نہ ہوئی۔ کوئی قصبہ کوئی شہر اور کوئی گاؤں ایسا نہ رہا جہاں سہہ بٹ نے مندروں کو برباد نہ کیا ہو۔ اسے ان مورتیوں کو توڑنے میں ایسا سکون ملا جیسا ایک مریض کو صحت یاب ہونے پر ملتا ہے۔ اس کاروائی پر برہمنوں نے کہا کہ ہم جان کی بازی لگاکر اپنے بتوں کا تحفظ کریں گے لیکن سہہ بٹ نے ان پر بھاری جرمانے عائد کئے۔ اس طرح ملک پر سہہ بٹ کی گرفت مضبوط ہوئی اور ان کے سامنے کوئی بھی طاقت سر نہ اٹھا سکی اور ملک میں مسلمانوں کی حکومت چھاگئی۔ اپنے زہر آلودہ الفاظ کے بعد جونراج نے سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ کو کشمیر کا ہیرو بناکر اپنے الفاظ بدل دیئے انہوں نے بڈشاہ کو اس طرح پیش کیا جیسے وہ ایک ہندو حکمران تھے۔ اس طرح ان کا متعصبانہ ذہن اور اسلام دشمن مزاج واضح ہوجاتا ہے۔ ان کی اسلام دشمنی کا اظہار ان کے یہ واقعات بیان کرنے سے ہوتا ہے کہ سید علی ایک لُون یعنی غیر کشمیری مسلمان مکہ سے کشمیر آیا وہ بہت سی کتابیں لے کر زین العابدین بڈشاہ کے پاس پہنچے چونکہ بادشاہ باصلاحیت لوگوں کی قدر کرتے تھے اس لئے سید علی نے اس کا فائدہ اٹھاکر عالم کے روپ میں بادشاہ کے ہاں تقرب حاصل کیا۔

دوسری طرف چند کم ضرف خود غرض مسلمان مورخوں نے حقیقت کے برعکس کشمیر میں اشاعت اسلام کی دلیل پیش کی ان کا کہنا ہے کہ سلطان سکندر کے زمانے میں اس ملک کے سارے کافروں اور مشرکوں کو مسلمان بنایا گیا۔ مسلمان حکمرانوں کے خوف سے کشمیر کے کافروں اور بت پرستوں نے اسلام قبول کیا کچھ لوگوں نے دل کی خوشی سے اور کچھ لوگوں نے جبر و قہر سے اسلام قبول کیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں تمام لوگوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے اسلام قبول کیا اور کسی سے کوئی زبردستی نہ کی گئی۔ اس طرح دونوں طرف سے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی اور دونوں طرف کے بیانات میں کوئی خلوص نظر نہیں آتا۔

تاریخی حقائق

تاریخی حقائق پر اگر بلا تعصب نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سلطان سکندر پر دونوں مسلمان اور ہندو مورخوں نے انتہا پسندی کے تناظر میں مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ پھر فرنگی انگریز فنکار بھی جب میدان میں اترے تو انہوں نے کھلم کھلا جھوٹ کا سہارا لے کر اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دیا۔ چونکہ صدیوں سے ان کا پیشہ یہی رہا ہے۔ اس لئے ان کے اس منافقانہ کردار کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ در حقیقت سلطان سکندر کے زمانے میں براعظم ایشائ کے دیگر لوگوں کے حالات اور اسلامی ممالک کے اضطراب کی کیفیت میں اب سدھار آرہا تھا اور ایک سو سال کے بعد اسلام پھر قوت کے ساتھ ابھر رہا تھا۔ کشمیر میں اسلام کی تبلیغ کی ذمہ داری صوفیا کرام نے قبول کی تھی یہ لوگ جگہ جگہ جاکر اشاعت اسلام کی ذمہ داری پوری کررہے تھے۔ اسی دوران براعظم ایشیا میں تیمور کی للکار جاری تھی۔ وہ تلوار کی نوک اور بربریت پر اسلام پھیلانے کے ہیرو مانے جاتے تھے اور وہ اس بات کا دم بھرتے تھے کہ ان کی تلوار اسلام کے قیام اور کفر کے خاتمے کے لئے ہے جیسا کہ ٹی این ارنالڈ (T. N. Arnold) نے اپنی کتاب The Teachings of Islam میں لکھا ہے کہ اگر وہ کشمیر میں داخل ہوجاتے تو وہ قہر و غضب کا طوفان مچاتے لیکن یہ سکندر کے سیاسی تدبر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اس سخت مزاج حکمران کو دوست بنا کر اپنے ملک کو ان کے غضب سے بچایا اور اس طرح دنیا کے

اضطراب اور بے چینی کے ماحول میں کشمیر کو ان چند ممالک میں شمار کیا جاتا ہے جہاں حالات پرسکون تھے۔

ئ میں جب محمد بن قاسم کی قیادت میں عربوں نے سندھ کو فتح کیا اور پورے ہندوستان میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی لیکن کشمیر ان کے تسلط سے باہر رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ کشمیر ان بلند بالائی برفانی پہاڑوں اور جنگلوں کی سرحدوں کی وجہ سے عربوں کی فتوحات سے محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ 1322ئ میں حضرت شیخ شرف الدین عبدالرحمان المعروف بلبل شاہ جن کا تذکرہ آچکا ہے نے کشمیر میں اسلام کی تبلیغ شروع کردی تھی اور کشمیر میں اسلام داخل ہوتے ہی یہاں کے غیر مسلم اکثریت طبقے ہندوؤں نے اسے دل و جان سے قبول کیا۔ کیونکہ نیچ ذات کے طبقے کے لوگ اونچی ذات والوں کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے۔ اسلام نے انہیں ان تمام برائیوں سے نجات دلائی جن کا سامنا یہ لوگ صدیوں سے کررہے تھے۔ درحقیقت مبلغین اسلام بھی اپنے مذہب کے سچے نمونے تھے وہ مذہبی تاجروں کی طرح اسلام کے دعویدار نہ تھے بلکہ وہ کشتیاں جلاکر یہاں اسلام کی خدمت کرنے آئے تھے۔ اس لئے یہاں کے لوگ بھی سچے دل سے ان کے گرویدہ (دلدادہ) ہوگئے اور انہوں نے بصدق دل اسلام کی دعوت قبول کی۔ اس طرح کشمیر میں اسلام بڑی تیزرفتاری سے پھیل گیا۔ چونکہ وسط ایشیا سے بڑی تعداد میں مسلمان یہاں داخل ہورہے تھے جن کی وجہ سے اسلام کو تقویت پہنچ رہی تھی۔

چونکہ یہ مسلمان راہب اور سنیاسی قسم کے لوگ نہ تھے بلکہ اصحاب علم و فن اور صنعت و حرفت کے ماہرین تھے۔ انہوں نے کشمیر کو تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی تربیت کی چونکہ وہ اسلام کے پرخلوص کارکن تھے۔ انہوں ''میرے دیش کی دھرتی'' کے بجائے ''اَلْاَرضَ لِلٰہِ وَا لْحُکمَ للّٰہُ'' یعنی زمین اللہ کی ہے اس پر اللہ کا حکم چلنا چاہیئے کی تعلیم دی۔ سکندر نے بھی اپنے دور حکومت میں کشمیریوں کو اسی سانچے میں ڈالنے کی کوشش کی اور اس ضمن میں انہوں نے نہایت فراخ دلی اور بلند حوصلے سے کام کرکے کشمیر میں تہذیبی اور اسلامی فکر کا انقلاب برپا کیا۔ اس کے لئے انہیں اسلامی ممالک کی طرف رجوع کرنا پڑا اور یہ کام انہوں نے بحسن خوبی انجام دیا اور کشمیر کو عراق اور خراسان کی مِثل بنایا۔ سلطان سکندر شرافت اور سخاوت میں اتنے مشہور ہوئے کہ عراق و خراسان سے علما اور دانشمند لوگ ان کی سلطنت میں ملازمت کرنے کے لئے کشمیر آئے۔ جس سے علم و ہنر میں اتنی ترقی ہوئی کہ کشمیر عراق اور خراسان کی طرح علم ہنر کا گھوارہ بنا اور مدرسوں مکتبوں اور مسجدوں کی تعمیر میں بھی اضافہ ہوگیا۔ جن بدعات اور رسوم بد کو ہندو مذہب میں کھلی چھوٹ تھی اسلام لانے کے بعد ان لوگوں نے ایسی چیزوں کو ہاتھ نہ لگایا اور انہیں یکسر مستردکیا۔ اسی طرح معاشرے کی مکمل اصلاح

اور تطہیر ہوئی۔ جو لوگ مندروں میں عبادت کرتے تھے انہوں نے نماز پڑھنے کے لئے مسجدیں تعمیر کیں، جو اپنی میتوں کو جلاتے تھے انہوں نے ان کو دفنانے کے لئے قبرستان بنادیئے۔ دراصل یہی وہ تبدیلیاں تھیں جو ہندو راسخ العقیدہ برہمن طبقے نے بری طرح محسوس کیں اور اس وجہ سے انہوں نے مخلصانہ جائزہ لئے بغیر سکندر کی مخالفت کی۔

ایک اور مورخ شری در مسلمانوں پر طنز کرکے کہتے ہیں کہ مسلمان مالی سختیاں برداشت کرکے قبروں پر عمارتیں اس لئے تعمیر کرتے ہیں کہ یہ لوگ اس بہانے سے زمین پر قابض رہیں اس کے برعکس ہندوؤں کا مذہب کتنا قابل تعریف ہے کہ ان کے لاکھوں مردے ایک گز زمین پر جل کر راکھ ہوجاتے ہیں۔ ایک ہندو مورخ راجہ بھٹ اپنی تاریخ راج ترنگنی میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ اگرچہ سکندر کے عہد حکومت میں بت شکنی کے واقعات رونما ہوئے ہوں گے مگر جس قدر سکندر پر بت شکنی کے الزامات عائد کئے جاتے ہیں وہ سراسر ایک غلط بیان ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق اس توڑ پھوڑ میں سکندر کے نومسلم وزیر سہہ بٹ مسلم نام صدر الدین کا ہاتھ تھا۔ وہ مسلمان بننے سے پہلے کٹر برہمن تھے اور برہمنوں کے عادات و خصائل سے واقف تھے۔ جب وہ مسلمان ہوئے تو انہوں نے بادشاہ سکندر کو خوش کرنے کے لئے مندر توڑ دیئے۔ چونکہ گھر کے بیدی ہونے کی وجہ سے وہ مندروں اور ان کے پجاریوں سے واقف تھے اس لئے انہوں نے سکندر کو خوش کرنے کے لئے مندروں کا توڑ پھوڑ کروایا۔ حالانکہ یہ سب جھوٹ اور بے بنیاد الزامات ہیں کیونکہ سکندر کے انتقال کے بعد مرزا حیدرؔ نامی ایک مہاجر کشمیر آئے انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''تاریخ رشیدی'' میں لکھا ہے کہ کشمیر میں اس وقت ایک سو پچاس (150) مستحکم اور مضبوط مندر موجود ہیں اور ابو لفضلؔ جب کشمیر میں وارد ہوئے تو انہوں نے بھی اس بات کا انکشاف کیا کہ اکبر جب 1605ئ میں کشمیر آئے تو انہوں نے بھی ہندوؤں کی بائیس (22) عبادت گاہوں (مندروں) کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔

مورخین کشمیر کو اس بات پر کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بلبل شاہ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے کشمیر میں اسلام کا آغاز کیا چونکہ وہ حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اس لئے یہاں کے لوگوں کی اکثریت حنفی مسلک سے وابستہ ہے۔ ان کی تشریف آوری کے پچاس سال بعد جب میر سید علی ہمدانی یہاں تشریف لے آئے تو انہوں نے جب دیکھا کہ یہاں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے وہ سارے کے سارے حنفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں تو انہوں نے مسلکی اختلاف کو نظر انداز کرکے اسلام کی اشاعت زور و شور سے شروع کی اور اس طرح وہ اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ حالانکہ وہ خود شافعی مسلک کی پیروی کرتے تھے۔

اسلام میں داخل ہونے کے لئے کوئی زور و زبردستی نہیں یہ بات قرآن سے ثابت ہے۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین۔ (دین میں کوئی زور و زبردستی نہیں) علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے کیونکہ اسلام روشن اور نمایاں ہے۔ اس کی دلیلوں سے حق کا طلب گار آسودہ اور بہرہ ور ہوتا ہے اور کھلے دل سے اسے قبول کرتا ہے۔ کسی کو جبراً مسلمان بنانا نامناسب ہے۔ یہ بات خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر؄ کے اس نصیحت سے بھی ثابت ہے جو انہوں نے جہاد پر روانہ کی گئی صحابہ کی ایک جماعت سے مخاطب ہو کر فرمائی تھی کہ دشمنوں کے ٹھکانوں پر پہنچ کر ان کا کوئی عبادت گاہ یا گرجا گر منہدم نہ کیا جائے نہ ان کا کوئی قلعہ توڑ دیا جائے جس میں وہ اپنے دشمنوں کے بچاؤ کے لئے پناہ گزین ہوں۔ نہ انہیں ناقوس (ایک قسم کے ساز) بجانے سے روکا جائے اور نہ ان کو عید کے دن صلیب (Crucifixion) کا جلوس نکالنے یعی عیسائیوں کا حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے کے خلاف مظاہرہ کرنے سے روکا جائے۔ بحوالہ الجہاد فی الاسلام۔ ان حقائق کے پیش نظر مسلمانوں پر مندروں اور بتوں کو توڑنے کا الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ پر مشرک ہونے کے الزامات

سلطان سکندر کی وفات کے بعد ان کے بیٹے زین العابدین بڈشاہ 827ھ میں تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے پچاس (50) سال تک کشمیر پر حکومت کی۔ اکثر مورخین کے مطابق ان کا دور حکومت کشمیر کی تاریخ کا سنہری دور مانا جاتا ہے اور ہندو مسلمان دونوں ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ لیکن اکثر مذہبی مورخین سیکولر (Secular) ہونے کی وجہ سے انہیں وشنو اوتار اور بھگوان اور ہندوؤں کا غمخوار قرار دیتے ہیں۔ دراصل شہاب الدین سے لے کر سکندر کے دور حکومت تک کشمیریوں کی مذہبی تبدیلی کی جو سرعت نظر آرہی تھی وہ اب مکمل طور پر رک گئی تھی اور زین العابدین بڈشاہ اب ملک کی تہذیبی، تمدنی اور اقتصادی ترقی کی طرف زیادہ دھیان دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ کشمیر اسلامی علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ بڈشاہ کے دور میں مذہبی انقلاب کی کوئی اہمیت نہ تھی اس لئے کشمیر میں اگرچہ مکمل طور پر اسلامی حکومت قائم ہوچکی تھی لیکن غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد ابھی موجود تھی۔ سلطان چونکہ سیکولر حکمران تھے اس لئے انہوں نے مذہبی رواداری سے کام لیا اور غیر مسلموں سے مذہبی رواداری کے پیش نظر حسن سلوک کیا۔ انہوں نے غیر مسلموں کو اپنے تمام مذہبی آداب و روسوم پر عمل کرنے کی اجازت دے دی اور اکثر کو اپنی حکومت میں شامل کر کے اپنے مشیر بنادیئے۔ ان کے دربار میں ہندو اور بدھ مت کے سرکردہ اہل علم بھی موجود تھے۔ اس مذہبی روادای سے غیر مسلموں نے خوش ہوکر انہیں وشنو اور نارائن یعنی بھگوان کا درجہ دیا۔ بحوالہ راج ترنگنی۔ پروفیسر کول (Professor Koul)۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کا تبدیلی مذہب (Conversion) ہندو مذہب چھوڑ کر مسلمان بننے کا سلسلہ رک چکا تھا۔ اگرچہ عام لوگوں نے زین العابدین بڈشاہ کی مذہبی رواداری کی مذمت نہیں کی لیکن مورخوں کی ایک بڑی تعداد نے ان کی زبردست تنقید اور مذمت کی۔ انہوں نے بادشاہ کو کافر، مشرک اور ملحد کے ناموں سے پکار کر مخالفت کی ۔ اس مہم میں نور بخشی اور اہل تشیع لوگ میر شمس الدین عراقی کی قیادت میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے واشگاف لفظوں میں سلطان زین العابدین بڈشاہ کو کافر اور مشرک قرار دیا (بحوالہ تحفۃ الاحباب) مورخوں کی اس تنقید کے باوجود لوگوں کی اکثریت سلطان زین العابدین بڈشاہ کو ایک مخلص مسلمان مانتی تھی۔ جن کی ذاتی زندگی اسلامی طرز عمل پر گزری اور انہوں نے رعایا پروری اور انصاف پسندی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ کر حکومت کی۔ ان کی زندگی میں تصوف کا رنگ نمایاں تھا۔ اس بنیاد پر ان کے غیر مسلم عقیدت مندوں نے انہیں وشنو کا درجہ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے خلافتِ اسلامی کے احترام میں

اپنے آپ کو خلیفۃ المسلمین کے نائب ہونے کا اعلان کیا۔ حالانکہ ان کے دور حکومت میں خلافت طرز کی حکومت کا کوئی وجود نہ تھا۔ سکندر نے غیر مسلموں پر ذمی ہونے کی بنا پر جو ٹیکس عائد کئے تھے زین العابدین بڈشاہ نے انہیں ختم کردیا۔ ان وجوہات کی بنا پر بعض مورخوں نے انہیں اکبر بادشاہ ثانی قرار دیا۔ کیونکہ اکبر نے جس طرح ہندؤں کے ٹیکس معاف کئے اور ہندو عورتوں سے شادی کرکے اور دین الٰہی کو قائم کرکے اپنے آپ کو ہندؤں کا ہیرو(Hero) بنادیا تھا اسی طرح بڈشاہ نے کشمیر میں ہندؤں کو ہر طرح کے ٹیکس معاف کرکے بڑے بڑے عہدے دے کر اپنے آپ کو قومی ہیرو بنادیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اکبر اَن پڑھ اور علم و فکر سے خالی تھے ان کی مذہبی رواداری ان کی دین بیزاری پر قائم تھی۔ اس لئے وہ چند ملحدوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن چکے تھے اور بعد میں علمائ ہند کی حکیمانہ کاوشوں سے وہ اپنے ڈگر پر آئے۔ اس کے برعکس زین العابدین بڈشاہ اپنے وقت کے ایک تعلیم یافتہ شہزادہ تھے۔ جنہوں نے اپنے باپ کے موروثی خلافت پر قدم رکھا تھا وہ علم و ہنر سے آراستہ تھے۔ وہ سچے مسلمان تھے لیکن دوسرے مذاہب کے قدردان تھے۔ وہ اسلامی تعلیم سے بھی آراستہ تھے لیکن دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کرتے تھے اور ان مذہبوں کو بھی جائز قرار دیتے تھے۔ الغرض زین العابدین کشمیر کے مسلمان بادشاہوں میں ایک متنازعہ مذہبی شخصیت تھی جنہیں کشمیر کے مسلمان اور ہندو دونوں اپنے اپنے عقیدے کے لحاظ سے خیر خواہ تسلیم کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ لادین سیاست (Secular Politics) کے شہنشاہ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

کشمیر میں مسلمان بادشاہوں کی حکومت کا یہ سلسلہ مغل حکمرانوں کی یلغار تک جاری رہا۔ بادشاہوں کی اس زنجیر کی آخری کڑی یوسف شاہ چک تھے۔ وہ شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ ایک عیاش حکمران تھے۔ ان کی بیوی حبہ خاتون کشمیر کی ایک مشہور شاعرہ اور نغمہ طراز تھی۔ ان کے گانے آج بھی کشمیریوں کے پسندیدہ گانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے دور حکومت میں پہلی بار کشمیر پر یلغار شروع ہوگئی۔ اس زمانے میں ہندوستان پر اکبر بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ انہوں نے کشمیر پر فوج کشی کی دلنہ بارہ مولہ کے ایک بڑے میدان میں جنگ ہوئی لیکن اس جنگ میں اکبر کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ دہلی واپس چلی گئی۔ اکبر کی فوج کی شکست کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ سردیوں کا موسم تھا۔ ان کی فوج سردیوں کا مقابلہ نہ کرسکی۔ اس لئے میدان جنگ سے فرار ہوگئی۔ واپسی پر ان کی ایک بڑی تعداد سخت سردی کی وجہ سے راستے میں ہلاک ہوگئی۔ اس کے بعد اکبر نے کشمیر پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کی لیکن انہیں کشمیر حاصل کرنے کی خواہش نے آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ اس لئے انہوں نے کشمیر کے بادشاہ یوسف شاہ کی تعریف کرکے انہیں ہندوستان آنے کی دعوت دی تاکہ دونوں ملکوں کی دوستی کو آگے بڑھایا جائے۔ جس سے ایک دوسرے کے کاروبار کو فروغ مل سکے۔ یوسف شاہ اکبر کی مکاری کے جھال میں پھنس گئے۔ وہ چند افراد کو ساتھ لے کر اکبر کے دربار میں پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کر انہیں جیل بھیج کر مہمان نوازی کی گئی۔ کشمیر کے ایک مشہور قلم کار پروفیسر غلام محی الدین حاجنی اپنے ایک رسالہ ''مجلہ شیخ نور الدین،'' میں لکھتے ہیں کہ یوسف شاہ کے اس نادانستہ اقدام کے بارے میں ایک بات یہ بتائی جاتی ہے کہ اس سازش میں چند سنی علما نے شیخ حمزہ مخدومی کی قیادت میں اکبر کا ساتھ دیا کیونکہ یوسف شاہ کو شیخ حمزہ کے ساتھ زبردست اختلاف تھا اور اس طرح یوسف شاہ کی نادانی کی وجہ سے کشمیر پر مغل حکمران قابض ہوگئے۔ (بحوالہ مجلہ شیخ نور الدین - پرفیسر غلام محی الدین حاجنی)

کشمیر پر قابض ہونے کے بعد مغل حکمران دہلی میں رہ کر گورنروں کے ذریعے کشمیر پر حکومت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ انہوں نے مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلائے وطن کرکے ہندوستان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ انگریزوں کے زیر اثر ہندوستانیوں نے انگریز ملکوں میں جاکر انگریزوں کے جدید تعلیمی نظام سے استفادہ کیا اور بڑی بڑی ڈگریاں لے کر اپنے وطن واپس آکر جدید تعلیم (Modern Education) کا خوب چرچا کیا اس طرح پورے ہندوستان پر انگریزوں کا رسم و رواج اور تہذیب (Culture and Civilization) حاوی ہوگیا اور لوگوں نے اس مغربی تعلیم اور تہذیب و ثقافت کو گلے لگایا۔ اسی دوران انگریزوں نے کشمیر کو جموں کے ڈوگروں کو پچھتر لاکھ (7500000) ہندوستانی سکہ (Currency) میں بیچ دیا اور اس طرح کشمیر پر جموں کے ڈوگروں کا راج شروع ہوگیا۔ چونکہ یہ لوگ مغربی تعلیم سے آراستہ تھے اس لئے کشمیریوں کے لئے ان کی حکومت Blessing in disguise یعنی خدا کی رحمت بن کر مغربی تعلیم کا ذریعہ بن گئی کیونکہ انہوں نے کشمیر میں حکومت سنبھالتے ہی لوگوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی۔ انہوں نے مغربی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مغربی طرز پر سکول اور کالج بنوائے جن میں ایس پی (S. P.) کالج اور امر سنگھ کالج قابل ذکر ہیں اور ان کالجوں میں کشمیر کے بہت سارے لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرکے گورنمنٹ ملازمت حاصل کی اور اپنی زندگی کو خوشحال بنایا۔

ئ میں جب ہندوستان کی تحریک آزادی کو کامیابی حاصل ہوئی اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا تو انہوں نے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرنے سے پہلے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ آزادی کے اعلان کے ایک دن پہلے مسلم اکثریت والے علاقوں کو پاکستان کا نام دے کر ایک علاحدہ ملک قرار دیا گیا جو بعد میں پاکستان کے سیاستدانوں کی نا اتفاقی کی وجہ سے دو حصوں میں بٹ گیا اور بنگلہ دیش کے نام پر ایک اور ملک وجود میں آگیا اس طرح ہندوستان ، برصغیر ہند تین حصوں میں بٹ گیا۔

تقسیم ہند کے وقت کشمیر میں جموں کے ڈوگروں کی حکومت تھی۔ انہوں نے کشمیر کا الحاق (Accord) ہندوستان سے کیا لیکن پاکستان نے کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کے پیش نظر کشمیر کو اپنے ملک کا حصہ جتایا اور اس پر دعویٰ بول کر حملہ کیا۔ اس وقت شیخ محمد عبداللہ کشمیریوں کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے کشمیر کی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ جب پاکستان کی فوج کشمیر میں داخل ہوئی تو شیخ عبداللہ نے انہیں بھگانے کے لئے ہندوستان سے مدد مانگی۔ ہندوستان کے حکمرانوں نے چند فوجیوں کو ہوائی جہاز کے ذریعے کشمیر بھیجدیا جنہوں نے کشمیر آئی ہوئی پاکستان کی فوجی ٹولی پر اچانک حملہ کرکے کشمیر سے بھگادیا۔ اس کے بعد شیخ محمد عبداللہ المعروف شیر کشمیر نے کشمیر کے وزیر اعظم لی حیثیت سے حلف اٹھایا اور حالات سدھر جانے کے بعد ہندوستان کے اُس وقت کے وزیر اعظم (Prime Minister) پنڈت جواہر لعل نہرو سے ہندوستانی فوج واپس بلانے کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے ٹال مٹول کرکے اپنی بھیجی ہوئی مختصر تعداد کی فوج نہ صرف کشمیر میں برقرار رکھی بلکہ مزید فوج کو کشمیر میں داخل کردیا جو آج تک کشمیر کے چپے چپے پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر چھوڑ دو کی تحریک چلائی جو 1975ئ تک زور و شور سے جاری تھی۔ لیکن اس تحریک و حکومت ہند نے بڑی چالبازی اور ہنرمندی سے خاموش کردیا۔ شیخ صاحب کو ہندوستان سے فوجی مدد مانگنے کی غلطی کا احساس ہوا لیکن ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کے علاوہ انہیں کوئی راستہ دکھائی نہ دیا اور انہوں نے کشمیر کے چیف منسٹر (Chief Minister) کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور تادم حیات اسی عہدے پر فایض رہے۔ آپ نے 1982ئ میں وفات پائی۔ اس کے بعد ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی طرح کشمیر میں جمہوری طریقے پر انتخابات کے ذریعے حکومت بنائی جاتی ہے۔

اور لوگ آئین ہند کے تحت غلامان بے دام کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں

زندگی زندہ دلی کا نام ہے

مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

ت 3

h ه

& إ